مارچ 2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

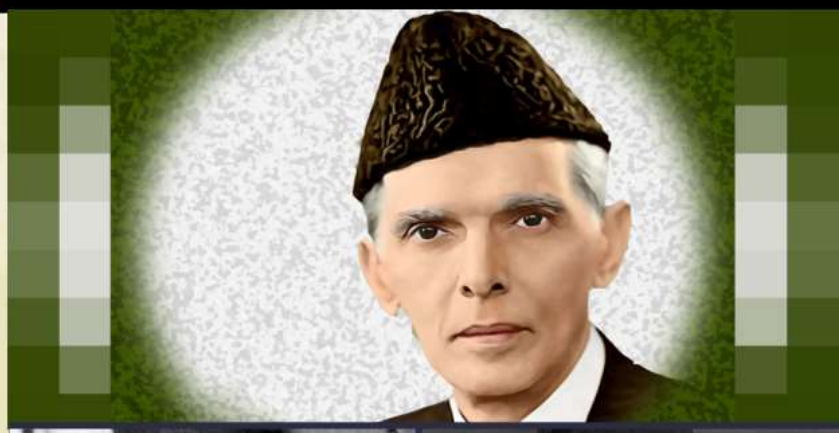

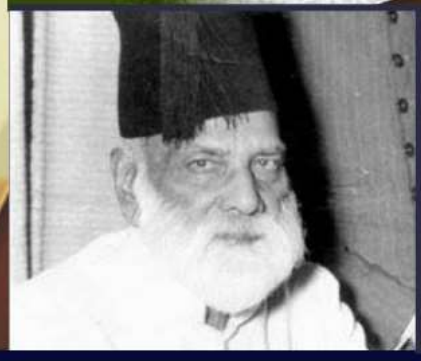

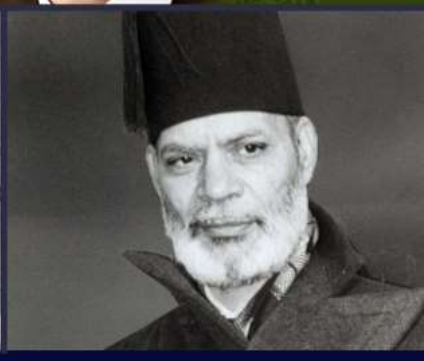

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

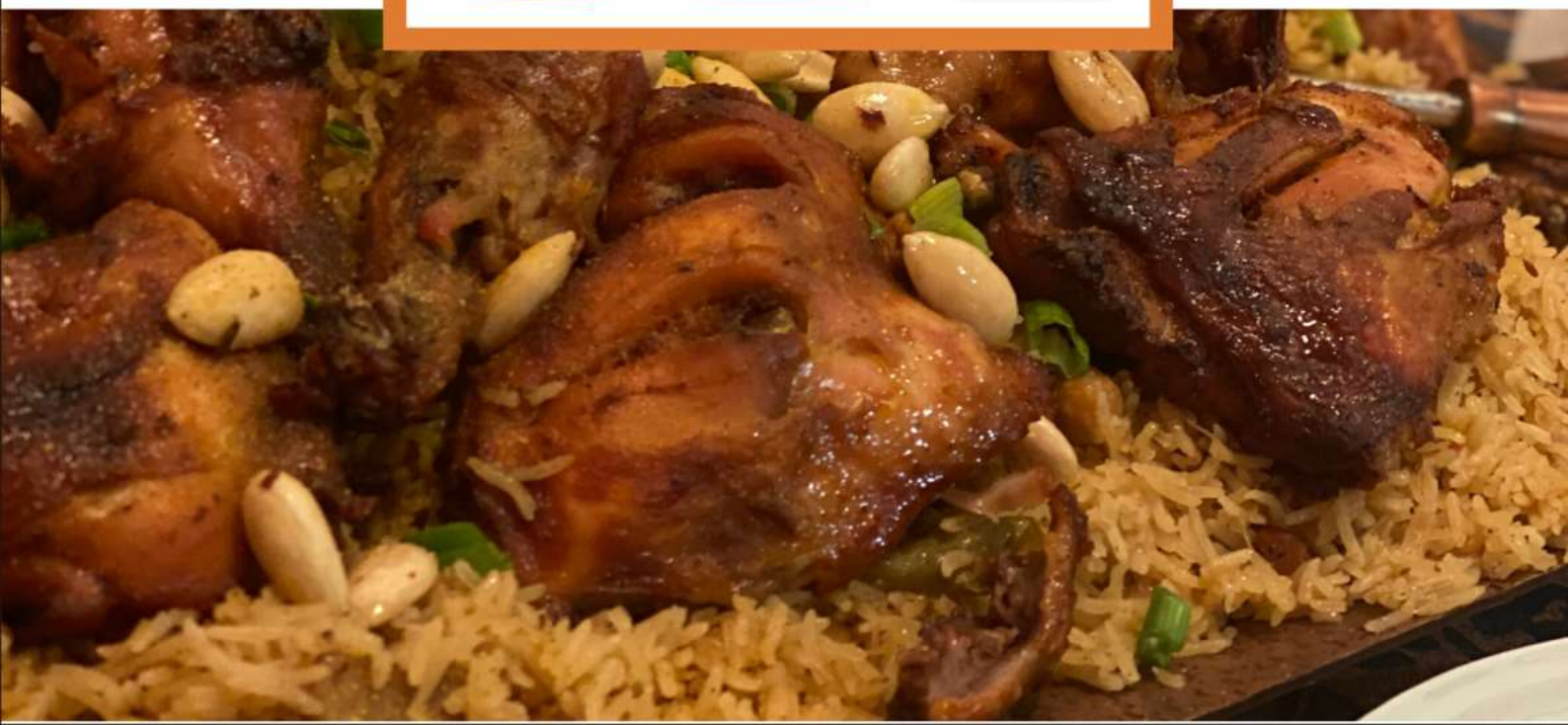

ھُوَالناصر — خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم — گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 03 رجب 1442 مارچ 2021ء

اس شمارہ میں

04 درسِ قرآن کریم

05 23 مارچ قراردادِ پاکستان اور اصل حقائق

07 مغلوں نے کراچی کے ساتھ تعصب برتا

08 ایک تعلیم دوست جاگیردار کی کہانی

11 مظہر برلاس کا ناقابل اشاعت کالم

12 1992ء کا ورلڈ کپ

14 کشمیری نوجوان جو کھلونا پستول کی مدد سے انڈین طیارہ لاہور لے آئے

19 یوم یکجہتی اور تنازعہ کشمیر واقعات کی روشنی میں

21 پاکستانی صحافیوں کی تنظیم جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے سالانہ انتخابات

22 بلوچستان میں تلور کا شکار: جب ضیاالحق نے سعودی شہزادے سے 'زبردستی' ملاقات کی

26 نائب وزیراعظم سردار ولبھ پٹیل کا گاندھی کے قتل سے کیا تعلق تھا؟

32 آسٹریلیا: قومی ترانے میں ایک لفظ کی تبدیلی اور ہزاروں برس کا قرض

34 مہاراجہ رنجیت سنگھ

36 خلائی جہاز کی تباہی جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا

37 'آگ کی جھیل' جسے مقامی لوگ 'جہنم کا دروازہ' قرار دیتے ہیں

39 چین کے اویغور کیمپوں میں منظم انداز میں مبینہ ریپ کا انکشاف

43 'امریکی تاریخ کی واحد بغاوت'

46 گل بہار مسلمان لڑکی جس کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کوڑے کھانے قبول کیے

48 اقوام متحدہ کا شہزادی لطیفہ کی قید کا معاملہ متحدہ عرب امارات کے ساتھ

49 مادری زبانوں کا عالمی دن

50 عدل و انصاف سے روگردانی خدا کا قہر

53 دوسروں کے عیوب چھپانا اور ناحق قتل کرنا؟

55 برصغیر میں اردو صحافت کا آغاز: چند جھلکیاں

57 دنیا کی اولین فہرستِ کتب اور کتابوں کے اشاریے

59 فائبر صحت بخش غذا ہے

60 سٹیویا پلانٹ

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

ظہیرالدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112

عابد شمعون چاند (سعودی عرب)

علی حسنین مسعود (بیورو چیف سینٹرل پنجاب)

انس احمد (بیورو چیف لاہور)

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

رحمت اللہ میر بلوچ (بیورو چیف بلوچستان)

محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیے۔

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۙ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ (سورۃ الرّعد آیت 44)

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۝ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ (سورۃ ابراہیم آیت 10)

ترجمہ:

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہتے ہیں تو مُرسَل نہیں ہے۔ تو کہہ دے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ بطور گواہ کافی ہے اور وہ بھی (گواہ ہے) جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔

کیا تم تک ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے یعنی نوح کی قوم کی اور عاد اور ثمود کی اور ان لوگوں کی جو ان کے بعد تھے۔ انہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے کھلے نشانات لے کر آئے تو انہوں نے (تکبر کرتے ہوئے) اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں رکھ لئے اور کہا یقیناً ہم اس چیز کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو انکار کرتے ہیں اور یقیناً ہم اس کے بارہ میں، جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہیں۔

تفسیر:

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہتے ہیں کہ تو مُرسَل نہیں ہے۔ تو کہہ دے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ بطور گواہ کافی ہے اور وہ بھی (گواہ ہے) جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ اس کے بعد سورۃ ابراہیم میں مختلف انبیاء کا ذکر ہے کہ ان قوموں نے انکار کیوں کیا ان کے انکار کی بنا یہی تھی کہ وہ رسولوں کو اپنے جیسا ایک انسان سمجھتے تھے جن پر خدا تعالیٰ کی پاک وحی نازل ہو ہی نہیں سکتی۔ سورۃ ابراہیم میں ایک نئی بات یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قتلِ مرتد کے عقیدے کی بحث اٹھائی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ قتلِ مرتد کا عقیدہ رسولوں کا انکار کرنے والوں کا اجتماعی عقیدہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے ہر رسول کو اپنے زعم میں مرتد سمجھتے ہوئے اس کے عواقب سے آگاہ کیا کہ ہم مرتد کو ضرور سزا دیا کرتے ہیں جو اپنی زمین سے، دیس سے نکالا ہے جب تک واپس ہماری ملت میں نہ لوٹ آئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں پر وحی فرمائی کہ تمہاری ہلاکت کا دعویٰ کرنے والے خود ہی ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جن زمینوں کے وہ مالک بنے بیٹھے ہیں ان کے بعد تم ان کے وارث بنا دیئے جاؤ گے۔ اور شجرۂ خبیثہ سے مراد انبیاء کے مخالفین ہیں جو اس طرح زمین سے اُکھاڑ پھینک دیئے جائیں گے جیسے وہ پودے جو تیز ہواؤں کے نتیجہ میں زمین سے اُکھڑ جاتے ہیں اور ہوائیں انہیں اس حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں۔ پس انبیاء کے مخالفین کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ بار بار اپنے مؤقف تبدیل کریں گے اور بالآخر خاک میں ملا دیئے جائیں گے۔

(قرآن کریم اُردو ترجمہ صفحہ 411 تا 412)

حدیث

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ نام کے سوا اسلام کا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ الفاظ کے سوا قرآن کا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اِس زمانہ کی مسجدیں بظاہر آباد تو نظر آئیں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان میں سے فتنے اُٹھیں گے اور ان میں ہی لوٹ جائیں گے۔ یعنی تمام خرابیوں کا وہی سرچشمہ ہوں گے۔

(مشکواۃ کتاب العلم الفصل الثالث، صفحہ 38 کنز العمال صفحہ 43)

اداریہ

23 مارچ قراردادِ پاکستان اور اصل حقائق

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

23 مارچ 1940ء کو لاہور کے منٹو پارک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تین روزہ سالانہ اجلاس کے اختتام پر یہ تاریخی قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اس کی بنیاد پر مسلم لیگ نے برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے حصول کے لئے تحریک شروع کی پھر 7 برس بعد اپنا مطالبہ منظور کرانے میں کامیاب رہی۔ شیرِ بنگال ابوالقاسم فضل الحق قائداعظم کے قریبی رفیق جنہوں نے تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ میں نمایاں اور قابلِ رشک کردار ادا کیا۔ آپ نے ہی 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں یہ قرارداد پیش کی تھی۔ یاد رہے لاہور کے اس تاریخی اجلاس میں پورے برصغیر سے لاکھوں افراد شریک ہوئے تھے اور اس اجلاس کی صدارت بابائے قوم حضرت قائداعظم نے فرمائی تھی۔

یہاں ان کی 23 مارچ 1940ء کی قراردادِ پاکستان کے اصل حقائق کی حیثیت کے حوالے سے ذکر کر رہا ہوں۔ قائداعظم نے 1929ء دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کے جواب میں 14 نکات پیش کئے جو کہ تحریک پاکستان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں ایک علیحدہ مملکت ریاست کا ذکر قابلِ ستائش ہے۔ 23 مارچ 1940ء میں قرارداد پاکستان لاہور پیش کی گئی جس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ریاست بنام پاکستان کی بنیاد ڈالی اور اس کے لئے مصروف عمل ہو گئے۔ قراردادِ پاکستان کس نے لکھی تھی؟ پاکستانیوں کو علم ہی نہیں کہ حصولِ آزادی میں ''قراردادِ پاکستان'' کا کیا کردار تھا۔ اہلِ علم اور قائد کے ساتھیوں کو اس کا بخوبی علم ہے۔ البتہ ہماری نئی نسل کے لئے یہ ضروری ہے۔ اس ضمن میں پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان صاحب فرماتے ہیں۔

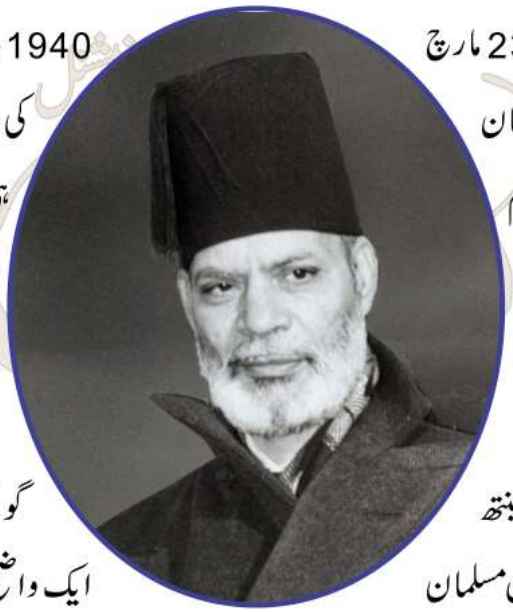

''میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ لارڈ لینتھ گو کے 12 مارچ کے خط میں میرے اس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اس حقیقت پر مبنی تھا کہ ہندوستان میں مسلمان ایک واضح طور پر علیحدہ قوم ہیں اور یہ کہ آئینی مسئلے کا واحد تسلی بخش اور قابلِ قبول حل یہ ہے کہ شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل فیڈریشن قائم کی جائے اور یہ بالکل وہی مطالبہ تھا جو کچھ دنوں بعد 23 مارچ 1940ء کی مسلم لیگ کی قرارداد میں پیش کیا گیا۔ دوقومی نظریہ شمال مشرقی اور شمال مغربی فیڈریشن کے قیام کی سکیم میرے نوٹ میں تفصیل اور وضاحت سے پیش کی گئی ہے جو میرے ہم عصروں یا مجھ سے پہلے لوگوں میں سے کسی دستاویز یا بیان میں قطعاً نہیں۔''

(بحوالہ پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء)

سر محمد ظفر اللہ خان کا وہ نوٹ جو انہوں نے لارڈ لینتھ کو بھجوایا تھا اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میرا یہ نوٹ ماہ فروری 1940ء کے آخری نصف میں تیار کیا گیا تھا تاکہ اسے سرکاری ڈاک والے تھیلے میں شامل کر دیا جائے جو لارڈ لینتھ گو کہ 12 مارچ والے خط سے پہلے جانا تھا اس خط اور میرے نوٹ کے بغور مطالعہ سے یہ بات کسی شک وشبہ کے بغیر واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نوٹ میں نے ذاتی طور پر پہل کر کے خود تیار کیا تھا اور میں اس کے مندرجات کے ہر حصے کا اکیلا ذمہ دار تھا۔'' (بحوالہ پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء)

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب نے یہ بات بھی واضح کی کہ لارڈ لینتھ گو نے 12 مارچ کو اپنے مضمون میں 1940ء کے مکتوب بنام سیکرٹری آف سٹیٹ برائے انڈیا میں خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ میرے نوٹ کی ایک کاپی پہلے ہی قائداعظم کو بھیج دی گئی تھی۔ جس نوٹ کی کاپی لارڈ لینتھ گو نے قائداعظم کی خدمت میں بھجوائی تھی چند دن بعد وہی سکیم ''قراردادِ پاکستان'' کی شکل میں مسلم لیگ کے اجلاس میں 2 مارچ 1940ء میں پاس کی گئی ہے۔ ''قراردادِ پاکستان'' کے مسودے کی وضاحت بیان کرنے کے بعد سر ظفر اللہ خان صاحب اپنے عجز کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

''میں نے ہمیشہ بار بار زبانی اور تحریری طور پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جہاں تک انسانی رشتوں کا تعلق ہے پاکستان صرف ایک شخص کی مخلصانہ اور بھرپور کوششوں سے معرضِ وجود میں آیا اور وہ قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ انہوں نے اکیلے ہی دم توڑتی ہوئی آل انڈیا مسلم لیگ کو پھر سے زندہ کیا اور اسے ایک فعال اور موثر سیاسی تنظیم میں مربوط کر دیا اور وہ اس کے مسلّم اور متحرک قائد تھے۔ ناقابلِ قبول نظر آنے والی مشکلات کے باوجود انہوں نے مقصد کو پالیا جو انہوں نے اپنے سامنے رکھا تھا اور اگرچہ متعدد لوگوں نے وفاداری اور صدق کے ساتھ ان کا ساتھ دیا تھا لیکن حصولِ پاکستان میں کامیابی کا کریڈٹ اکیلے محمد علی جناح کو جاتا ہے۔ اس بارے میں کسی جہت سے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔'' (پاکستان ٹائمز 13 فروری 1982ء)

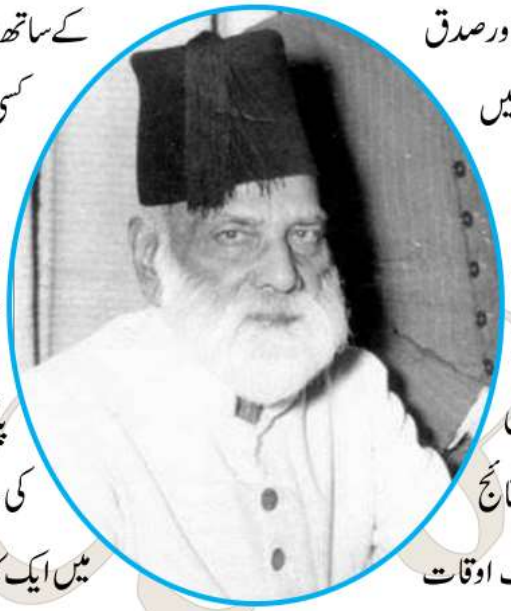

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان قوم کے وہ خوش بخت سپوت تھے جن کو دیانت، محنت اور اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے غیر منقسم ہندوستان میں بھی اعلیٰ ذمہ داریاں سونپی گئیں جن کی انجام دہی میں وہ ہر لحاظ سے نہایت کامیاب و کامگار ثابت ہوئے۔ تحریکِ آزادی پاکستان اور قراردادِ پاکستان کے حوالے سے بھی چوہدری ظفر اللہ خان کو نہایت ہی مؤثر اور دوررس نتائج کی حامل خدمات انجام دینے کی توفیق ملی۔ یاد رہے متحدہ ہندوستان میں چوہدری صاحب موصوف نے مختلف اوقات میں ایک کامیاب وکیل، وائسرائے کونسل کے ممبر، آج کے دور میں مرکزی وزیر، فیڈرل کورٹ (یعنی سپریم کورٹ) کے معزز جج۔ ان سب سے بڑھ کر مسلم لیگ کے ایک فعال اور کامگار لیڈر کے طور پر مسلمانانِ ہند کی نمایاں خدمات انجام دیں جن کی وجہ سے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی متحدہ ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد کی اہم اور نمایاں خدمات اور کامیابیوں کا تذکرہ تاریخ ماضی بعید کا حصہ بن چکا ہے۔ چودھری صاحب موصوف نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک اجلاس کی صدارت فرمائی اور کئی مرتبہ ہندوستان کی طرف سے عالمی سطح پر نمائندگی کرتے رہے علاوہ ازیں آپ جنرل اسمبلی اقوامِ متحدہ کے اجلاس کی بھی صدارت فرما چکے ہیں۔ آپ پرنسز آف انڈیا چیمبر کے مشیر، انڈیا میں چین کے ایجنٹ جنرل، صدر انٹرنیشنل جسٹس کورٹ آف ہیگ (ہالینڈ) اور 1937ء میں کنگ جارج ششم کی تقریب تاج پوشی میں برٹش انڈیا اور وائسرائے آف انڈیا کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

آج ہمیں ان رہنماؤں کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے جنہوں نے اس قرارداد کو تحریر کیا اور پیش کیا۔ ان کی خدمات اور تعلیمات کو نصابِ تعلیم کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ طالبعلم نظریہ پاکستان کے اصل حقائق اور اس کی روح سے روشناس ہوں۔ بعد میں آنے والوں نے اس حقیقت کو فراموش کر کے اصل حقائق سے روگردانی کی ہے اور وہ قوم کے مجرم ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نظریہ پاکستان اور بابائے قوم حضرت قائداعظم کے اصولوں پر صحیح معنوں پر چلنے کی توفیق دے آمین۔

مغلوں نے کراچی کے ساتھ تعصب برتا

تحریر: عثمان جامعی

لاہور والو! تمہیں مبارک ہو، تمہارے شہر کو نیویارک ٹائمز نے رواں سال دنیا کے 52 بہترین سیاحتی مقامات میں شامل کرلیا ہے۔ اور ہاں، یہ مبارکباد ہم خوشی خوشی نہیں بڑے دُکھی دل کے ساتھ دے رہے ہیں، کیونکہ ہمارے شہر کراچی کو اس فہرست میں جگہ نہیں دی گئی۔ نیویارک ٹائمز نے لاہور کے لائقِ سیاحت ہونے کا سبب لاہوریوں کی زندہ دلی، مہربان فطرت، مہمان نوازی، لذیذ کھانے، سردیوں میں دھند کے پار سے چھلکتی روشنیوں کے نظارے اور مغلیہ عمارتوں کو قرار دیا ہے۔ یہ تو کراچی کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے، آخر کراچی اور کراچی والوں میں کس بات کی کمی ہے کہ یہ شہر اس فہرست میں جگہ نہ پاسکا۔ دراصل ہمارا شہر شرمیلا بہت ہے۔ شہر کی شرم وحیا کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب مردم شماری کرنے والے دروازوں پر آئے تو کراچی کی آدھی آبادی نے شرم کے مارے دروازہ کھولا ہی نہیں اور 'اوئی اللہ، جانے کون اجنبی ہیں موئے' کہہ کر گھر میں بیٹھی رہی اس لیے شمار نہ ہوسکی۔ اسی شرمیلے پن کی وجہ سے کراچی اپنے بارے میں کچھ بتاتا نہیں، ورنہ لاہور اور لاہوریوں میں ایسا کیا ہے جو کراچی اور 'کراچویوں' میں نہیں۔ چلیے ہم کراچی کے سیاحتی مقامات اور اس شہر کے باسیوں کی خصوصیات بتائے دیتے ہیں۔ بات شہریوں کی صفات سے شروع کرتے ہیں۔ ہم کراچی کے لوگ کیا لاہور والوں سے کم زندہ دل ہیں! یہ زندہ دلی ہی تو ہے کہ ہم میں سے بہت سے اب تک کراچی کو عروس البلاد کہتے ہیں، حالانکہ اس عروس کا چہرہ کسی کھڑوس بڑھیا کا ہو چکا ہے۔ مہربان تو ہم ایسے ہیں کہ ہمارے بارے میں ہی کہا گیا

مہرباں 'ہوں میں' بُلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

مہربانی کی یہ تصویر ہماری سیاسی قیادت حکمرانوں کو دکھاتی رہتی ہے۔ مہمان نواز تو ہم ایسے کہ پوچھیے مت، مہمان کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ اس کے آنے کی خبر ملتے ہی کہہ دیتے ہیں، 'ارے جب چاہیں آئیں، آپ ہی کا گھر ہے، مگر 3 دن سے آپ کے اس گھر میں پانی نہیں ہے'۔ رہے لذیذ کھانے، ان میں تو ہمارا جواب ہی نہیں۔ صرف گائے کے گوشت کے ہم ایسے ایسے مزے دار پکوان بناتے ہیں کہ خود گائے حیران ہو کر کہتی ہے ایسی 'بریانی' بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔ لاہور میں صرف سردیوں میں دھند کے پار روشنیوں کے نظارے دل فریب لگتے ہیں، ہمارے 'کراچی' میں تو پورا سال دھواں اور دھول روشنی اور آنکھوں کے بیچ حائل رہتی ہے۔ اگر سیاح سائنسداں بن کر تمیز کرنے کی کوشش نہ کریں تو دھوئیں اور دھول کے پار دکھائی دینے والی روشنی بھی وہی لطف دے گی جو دھند میں چھپی روشنی دیکھنے میں ہے۔ اب رہ گئیں مغلیہ یا تاریخی عمارتیں۔ اب کیا کریں بھیا! مغلوں نے کراچی سے بڑا تعصب برتا۔ یہاں کوئی چھوٹی موٹی عمارت بھی نہ بنوائی۔ ہمیں تو لگتا ہے یہ مغل لاہور کے علاقے 'مغل پورہ' کے رہنے والے تھے، اسی لیے لاہور کو نوازتے رہے۔ چلو مغلوں نے جو کیا وہ کیا، یہ باقی کے بادشاہ لودھی، خلجی، سوری بھی کراچی سے دُور دُور عمارتیں بنواتے رہے، ہمارے شہر میں کوئی عوامی بیت الخلائی، 'گھوڑا اسٹاپ' (بسیں تو جب تھیں ہی نہیں) یا بیرون شہر جانے والوں کے لیے ہاتھیوں کا اڈا بنا دیتے تو ہمارا شہر بھی تھوڑا بہت تاریخی ہو جاتا۔ کچھ نہیں تو کسی سڑک کی استرکاری ہی کرا دیتے۔ اس میں خود ان کا بھی فائدہ تھا، کیونکہ اس شہر میں سڑک پر ڈامر بچھانے سے پلیہ بنانے تک کسی بھی تعمیر میں ٹھیکے دار اور معمار کے کروڑوں بن جاتے ہیں۔ یہ بادشاہ کراچی میں چائنا کٹنگ کے ذریعے آبادیاں بنا کر اپنا خزانہ بھر سکتے تھے، مگر شاید انہیں اس معاملے میں کوئی 'کمال' میسر نہیں تھا۔ واضح رہے کہ کراچی میں بادشاہوں اور ان کی نشانیوں کے نہ ہونے کی بات ہم ماضی اور حال کے مؤرخ کی لکھی گئی تاریخ کی روشنی میں کر رہے ہیں، مستقبل کا مؤرخ جب تاریخ لکھے گا تو اس میں کراچی کے بادشاہوں اور ان کی یادگاروں کے ذکر سے صفحات کے صفحات بھرے ہوں گے۔ وہ لکھے گا کہ جس طرح کبھی پنجاب میں سکھا شاہی تھی، اسی طرح کراچی میں 'سیکٹر شاہی' مچی رہی۔ یہ تذکرہ ہے مغلوں کی طرز کے 'ساشے پیک' بادشاہوں کا۔ مغلوں کی طرح یہ بھی تعمیر کا شوق رکھتے تھے، لیکن انہوں نے تاج محل جیسی عمارتوں پر پیسہ ضائع نہیں کیا، بلکہ غریبوں کے لیے چھوٹے چھوٹے مکان بنا کر انہیں بیچتے رہے، مفت میں بھی دے سکتے تھے، لیکن بیچے اس لیے کہ غریبوں کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ تاج محل پر پیسہ لٹا کر شاہ جہاں نے جو بدنامی کمائی اسے دیکھتے ہوئے ان بادشاہوں نے یہ خیال رکھا کہ تعمیرات پر رقم ضائع نہ ہو، چنانچہ سرکاری زمینوں پر اسی طرح قبضہ کیا جس طرح مغل راجپوتانے سے دکن تک کرتے رہے تھے، پھر ان پر مکانات بنوائے۔ ان کی ایک اور خصوصیت جو انہیں مغلوں سے جدا کرتی ہے ان کا لمبے چوڑے القابات سے گریز تھا، وہ چاہتے تھے کہ رعایا انہیں اپنے ہی میں سے سمجھے، اس لیے بھاری بھرکم القاب کے بجائے کالا، ٹیڑھا، موٹا جیسی خالص عوامی عرفیتیں اختیار کرتے تھے، بس ان کے نام کے ساتھ بھائی کا سابقہ لگانا ضروری تھا وہ بھی سابقہ پڑنے پر۔ شہر کے کچھ حصوں میں 'حقیقی بادشاہت' بھی خاصے عرصے تک قائم رہی۔ کچھ حصوں پر مشتمل ہونے کے باوجود اسے 'آفاقی بادشاہت' بھی کہا جاتا ہے، غالباً اس لیے کہ یہ بادشاہت ایک دن اچانک قائم ہوئی تھی، لہٰذا اسے اوپر سے نازل شدہ سمجھا جاتا تھا۔ شہر کے ایک علاقے میں کسی شاہی خاندان کی جگہ 'گینگ' کی بادشاہت قائم تھی۔ یقیناً یہ بہت بہادر تھے، اسی لیے انہیں 'جیالے بادشاہ' کہا جاتا ہے۔ جس طرح ماضی میں رجواڑے ہوا کرتے تھے، اسی طرح کراچی کے مضافات میں ایک 'راؤواڑا' تھا، جس کا راجا مقابلوں کا بڑا شوقین تھا۔ اب اتنے سارے بادشاہوں کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ کراچی میں ان کی یادگاریں اور ان سے منسوب تاریخی عمارات نہ ہوں۔ پس تو یہ مسئلہ بھی حل ہوا، اور لاہور کو اس معاملے میں بھی کراچی پر فوقیت نہیں رہی۔ اب انتظار بس اس بات کا ہے کہ کب ان بادشاہوں اور ان کی یادگاروں کی تشہیر ہو، جس کے باعث کراچی بھی تاریخی شہر قرار پائے، اور اسے بہترین سیاحتی مقامات کی فہرست میں دیکھ کر ہمارے دل کو قرار آئے۔

ایک تعلیم دوست جاگیردار کی کہانی

تحریر: ابوبکر شیخ

اندرونِ سندھ کی تپتی اور خاموش دوپہروں میں جب کوئل بھی نہیں گاتی، اور میں امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوتا، تو امی آسمان سے آتے ہوئے فرشتوں کے متعلق باتیں سناتیں کہ وہ اپنے ساتھ خدا کی رحمتیں اور نوازشیں لے کر زمین پر آتے ہیں۔ میری امی نے کبھی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا، کیونکہ وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ ان دوپہروں میں امی کی شیریں باتیں سن کر میری آنکھوں میں نیند بھر آتی اور میں ان کی گود میں سو جاتا۔ جب بڑا ہوا تو (فرشتوں) کا لفظ جب بھی یاد پڑتا تو میں ڈھونڈنے لگتا کہ کہیں کسی روپ میں نظر آجائے، پر دکھا نہیں۔ کچھ لوگوں کے متعلق سنا کہ فرشتوں جیسے ہیں۔ پر ان سے ملنا ممکن نہ ہوا۔ پھر ایک دوست نے میر غلام محمد تالپور کا ذکر کیا جن کی کوئی اولاد نہیں تھی، پر سارے غریب بچوں کو وہ بغیر کسی تفریق کے اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ ویسے بھی اولاد میں کوئی بھی تفریق نہیں کرتا۔ بدین سے 27 کلومیٹر مشرق میں ایک چھوٹا سا شہر ہے ٹنڈو باگو (1)۔ عجیب سا شہر ہے، جس جگہ کے متعلق پوچھو تو اس جگہ سے ایک کہانی وابستہ ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ جو نہر (باگو واہ) بہتی ہے، اس سے (میر باگو اور سندھ رانی) کی مشہور عشقیہ داستان وابستہ ہے۔ پھر آنکھوں کا وہ مشہور فلاحی ہسپتال بھی ہے جو اب تک لاکھوں بے نور آنکھوں کو نور لوٹا چکا ہے۔ پھر 1940 کا بنا (صاحب محل) بھی ہے، جسے دیکھنے کے لیے سارے پاکستان سے لوگ آتے ہیں۔

1920 وہ زمانہ تھا جب سادگی اور غربت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ گورے کا راج تھا، موئن جو دڑو کی کھدائی نہیں ہوئی تھی، جاگیریں، خان بہادر، خان صاحب کے لقب اور آفرین نامے بانٹنے کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گندم چالیس کلو ایک روپے میں ملتے تھے، اور دیسی گھی چار آنے کلو کا بکتا۔ کراچی کی الفنسٹن اسٹریٹ کا نام بھی ابھی زیب النسا اسٹریٹ نہیں پڑا تھا۔ میں 1923 میں مکمل ہونے والے لارینس مدرسہ کے ڈائننگ ہال کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ اپنے وقت میں بڑی خوبصورت عمارت رہی ہوگی، جہاں کسی زمانے میں وہ بچے کھانا کھاتے تھے، جن کے گھر کچے ہوا کرتے، اور جنہیں کھانے کے لیے روکھی روٹی بھی مشکل سے ملتی تھی۔ اس ہال کے جنوب میں گبسن بورڈنگ ہاؤس کی وہ خستہ عمارت ہے جس میں دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے بچے شب و روز گذارتے تھے۔ اب اس ہاسٹل میں کوئی نہیں رہتا، بس تنہائی رہتی ہے، اور دیواریں ماضی کے خوبصورت دنوں کی یادیں آپس میں بانٹتی ہیں۔ یہ ڈائننگ ہال اور گبسن ہاسٹل، لارینس مدرسہ (جو اب گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے) کی اس پرشکوہ عمارت کا حصہ ہیں جو 1924 میں بن کر مکمل ہوا تھا۔ اور اب تک لاکھوں شاگرد اس اسکول سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ میں اسکول کی اس تاریخی

اور خوبصورت عمارت کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں، جو صرف زندگی نہیں گزارتے، بلکہ تاریخ بھی بُنتے ہیں۔ اگر وقت اپنی سنگدلی پر آئے اور اپنی کوکھ سے ایسے انسانوں کو جنم دینا چھوڑ دے تو شاید یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں رہے گی۔ میر غلام محمد تالپور (مانکانی میروں) کے خاندان سے تھے۔ ان کی جاگیر ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک جاگیردار تھے، اور ان کو برٹش راج کی جانب سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ میں لارینس مدرسہ کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر پروفیسر محمد اسماعیل میمن سے ملا۔ یہ صاحب خود بھی چند کتابوں کے مصنف ہیں۔ میر صاحب کے متعلق انہوں نے جو باتیں کیں، ان میں میر صاحب کے متعلق احترام کی ایک خوشبو تھی جو الفاظوں میں بستی تھی۔ "میں نے اس اسکول سے تعلیم حاصل کی ہے، اور آج میں اسی اسکول کا پرنسپل ہوں۔ یہ سب میر صاحب کی وجہ سے ممکن ہوا۔ وہ فرشتہ تھے، ایک ایسا فرشتہ جس نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں سوچا، جب بھی سوچا غریب اور ناداروں کے لیے

سوچا۔" 1914 کی پہلی جنگ عظیم میں میر صاحب نے ہندسرکار کو 1 لاکھ روپیہ قرض دیا تھا، جوانہوں نے بعد میں واپس کیا، اوراس عمل کے بدلے میں میر صاحب کو خان بہادر کا خطاب دیا۔ 1920 میں میر صاحب نے محمد صدیق مسافر، جن کا تعلق ٹنڈو باگو سے تھا، سندھی زبان میں بہت ساری کتابوں کے مصنف بھی تھے، اور اس زمانے میں حیدرآباد میں ٹیچر تھے، کو اسکول کے متعلق اپنے خیالات بتائے، اوراس طرح 90 برس پہلے ایک کرائے کی جگہ میں لارینس مدرسہ کی ابتدا ہوئی، اور دھیرے دھیرے ہاسٹل اوراسکول کی بلڈنگ 1924 میں بن کر مکمل ہوئی۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ ہی عرصہ پہلے علی گڑھ سے سرسید احمد خان نے تعلیمی تحریک شروع کی تھی، جس کے زیرِ اثر کراچی میں سندھ مدرستہ الاسلام چل رہا تھا۔ 1976 میں میر غلام محمد کی 44 ویں برسی کے موقع پر ایک کتاب (ھھڑا مانجھی مرنا ناھن) شائع ہوئی، جس میں بڑے اہم آرٹیکل تحریر ہیں۔ میں نے بڑی کوشش کے بعد اس کتاب کے ترتیب کنندہ (بھون سندھی) سے رابطہ کر کے اس کتاب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی حاصل کی۔ اس کتاب میں لکھا ہے: "1932 میں گورنمنٹ سے ہائی اسکول کا درجہ حاصل کرنے والے اس اسکول کے پہلے مدرس اعلیٰ یا ہیڈ ماسٹر، مسٹر عبدالرحیم کرمتی بلوچ مقرر ہوئے جو حیدرآباد میں وکیل تھے۔ گبسن ہاسٹل کو مسلسل چلانے کے لیے میر صاحب نے گورنمنٹ کے Benevolent Fund میں 383,000 روپے ڈپازٹ کیے، جس سے ماہانہ ملنے والے پیسوں سے ہاسٹل کا خرچہ چلتا تھا۔ (2) تو اب یہ ہاسٹل کیوں بند ہے؟ میں نے اسماعیل میمن صاحب سے پوچھا۔ یہ 2004 سے بند کر دیا گیا ہے کیونکہ ان جمع پیسوں سے ہر ماہ اتنے کم پیسے ملتے ہیں کہ ہاسٹل کو چلانا ممکن نہیں ہے۔ میرے سوال کے بدلے جو جواب مجھے ملا، وہ انتہائی مایوس کن تھا۔ مجھے اس وقت میر صاحب کی یاد آئی۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا، پر پھر بھی ان کی بڑی یاد آئی۔ اس کتاب کے مطابق 1928 میں ٹنڈو باگو کے میر محلہ میں میر صاحب نے عورتوں کے اسکول کے لیے بلڈنگ بنوا کر مکمل کی، اور لوکل بورڈ کے حوالے کی۔ مقامی طور پر کیونکہ ٹیچرز کا ملنا ممکن نہیں تھا، اس لیے دوسرے شہروں سے اہتمام کیا گیا اور اچھے الاؤنس اور طعام و قیام کی سہولت دے کر اسکول میں مقرر کیا گیا۔ یہ اسکول ابھی تک اس جگہ پر ہے، بس وہ بلڈنگ نہیں ہے جو میر صاحب نے بنوائی تھی۔ موجودہ گورنمنٹ کی بنائی گئی عمارت میں 150 کے قریب بچیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ میر صاحب کی نیکیوں کا سفر یہاں پر ختم نہیں ہوتا۔ انہوں نے غریب، بے سہارا، اور اپاہج مریضوں کی لیے خاص وظیفے مقرر کیے تھے، جو ان کی مالی مدد کرتے۔ لوگوں کی غربت دیکھ کر 1922 میں بولس شفاخانہ کی بنیاد ڈالی، جہاں مفت میں علاج ہوتا۔ اگر علاج طویل ہو جاتا، تو مریض کی رہائش، خوراک، اور دواؤں کا مفت انتظام ہوتا۔ ڈاکٹر یعقوب مغل، جو اس وقت ڈاکٹر این اے بلوچ ہیریٹیج ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر ہیں، اور بہت عرصہ ترکی میں بھی رہے، نے بھی یہاں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کتاب کے لیے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "وہ عظیم انسان تھے۔ غریبوں کا دکھ ان سے سہا نہیں جاتا تھا۔ 1931 میں انہوں نے عورتوں کے لیے ہسپتال کھولا۔ اس زمانے میں لیڈی ڈاکٹر ملنا ناممکن سا تھا، مگر میر صاحب نے بڑی جستجو کے بعد ایک یورپی لیڈی ڈاکٹر ہسپتال میں مقرر کی، اور شفا کے دروازے کھل گئے۔ ساتھ میں وہی میر صاحب کی دریا دلی اور شفقت کہ علاج اور دوائیں مفت، رہائش اور کھانا بھی مفت۔"

فقط یہ ہی نہیں، بلکہ بہت سارے علم کے پیاسوں کو میر صاحب نے انگلینڈ، دہلی، لاہور، ممبئی، اور کراچی بھیجا، اوران کا سارا خرچہ میر صاحب نے بھرا۔ کوئی علم کا ڈاکٹر بن کر لوٹا تو کوئی فاضل طب و جراحت کا اعزاز لے کر آیا۔ ہزاروں ایسے بڑے نام گنوائے جا سکتے ہیں، جو ماضی و حال میں بڑے نامور نام ہیں اور وہ محض اس لیے ہیں، کہ میر صاحب تھے۔ اس ہائی اسکول کو 1990 میں اپ گریڈ کر کے ہائیر سیکنڈری کا درجہ دیا گیا، تب سے اب تک، یہاں سے انٹر پاس شاگردوں کی تعداد 4776 ہے۔

نتھومل موروانی، جنہوں نے اس اسکول میں بنیادی تعلیم حاصل کی، پھر یہاں آ کر استاد ہوئے، لکھتے ہیں کہ "آج تک اسکول کے سینکڑوں شاگردوں کو ہاسٹل میں مفت کھانا اور رہائش ملتی ہے۔ اس اسکول سے آج تک ہزاروں طالب علم تعلیم حاصل کر کے نکلے ہیں، جن میں سے بہت سارے اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ بہترین سیاستدان، عالم، ادیب، مفکر، ڈاکٹر اور استاد اس اسکول کی مان ہیں۔" میں ایک اخبار لے کر وہاں کے مقامی صحافی عثمان راہوکڑو کے پاس پہنچا اور ان عمارتوں کی خستگی کے متعلق پوچھا۔ جواب ملا، وہ آپ بھی پڑھ لیں: "آپ خوش نصیب ہیں کہ یہ گرتی ہوئی دیواریں تو کم سے کم دیکھ رہے ہیں۔ دس برسوں کے بعد شاید یہ بھی دیکھنے کو نہ ملیں۔ یہاں اثاثے سنبھالے نہیں جاتے، بلکہ برباد کرنے کی روایت ہے۔ ایک زمانے میں اسکول میں بہت بڑی لائبریری تھی، اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔" میر صاحب اس وقت اگر آ جائیں، تو خون کے آنسو روئیں گے۔ میر صاحب بڑے انسان تھے، بہت بڑے۔ یہ اسکول 2003 میں قومی لوک ورثہ کی لسٹ میں شامل ہے اور اس وقت جو اسکول کا نام ہے، اس میں میر صاحب کا نام تک شامل نہیں۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ میر غلام محمد نے اتنے سارے ادارے بنائے، پر کسی پر بھی اپنا نام نہیں رکھا۔ یہ ان کا بڑا پن تھا۔ پر ان کے جانے کے بعد جب نیا نام رکھ رہے تھے تو کیا میر صاحب کا نام موزوں نہیں تھا؟" یہ المیہ ہے؟

عثمان راہوکڑو نے یہ بھی بتایا کہ میر صاحب کا ایک گشتی شفاخانہ بھی تھا، جو اونٹوں اور بیل گاڑیوں پر ہوتا تھا اور دور دراز علاقوں میں جا کر علاج کی سہولیات فراہم کرتا، گاؤں

ماچوری اور کھڈ ہرو (ٹنڈو باگو) میں میر صاحب نے اسکول اور ہاسٹل بھی بنوایا تھا۔ میں نے ٹنڈو باگو میں اس مسافر خانہ کی تلاش کی جو میر صاحب نے بنوایا تھا کہ مسافر آتے جاتے ہیں، دھوپ ہے، بارش اور سردیاں ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے اور عورتیں کہاں جائیں گے۔ لیکن اس مسافر خانہ کا مجھے کوئی نشان تک نہیں ملا۔ ٹنڈو باگو کی گلیوں میں نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو میر صاحب کی شفقت کے گیت گاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ میر صاحب کا ایک خادم تھا، جمعہ خاصخیلی، میر صاحب نے اس کے بیٹے کو اس کی خواہش پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی بھیجا۔ اور جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے آیا، تو دنیا نے دیکھا کہ جمعہ کا بیٹا قادر بخش لارینس مدرسہ کا ہیڈ ماسٹر بنا۔ میر صاحب کے متعلق مجھے جتنی معلومات ملتی گئی وہ حیران کر دینے والی تھیں۔ حیرت اور احترام کے بیچ تھے جو میری روح کی زمین پر اُگتے جاتے۔ 1928 میں ایک تعلیمی کانفرنس ہونی تھی، جس میں شرکت کے لیے جی ایم سید صاحب نے ایک دعوت کا خط میر صاحب کو بھیجا تھا۔ جس کا جواب میر صاحب نے تحریر کیا تھا۔ یہ انتہائی مختصر خط ہے، مگر تاریخی حقائق کے حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ لکھتے ہیں:

20 جنوری کا آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ میں بہت دکھی ہوں۔ اپنے جو وسائل ہیں وہ بروئے کار لا کر جو ہو سکتا ہے وہ کر رہا ہوں۔ پر عام لوگوں کی جہالت، بیکاری اور غربت دیکھ کر رو پڑتا ہوں۔ میں نے اپنی ساری ملکیت ان لوگوں کے لیے وقف کر دی ہے پر میں اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہوں؟ سندھ کے جاگیردار، زمیندار، پیر، اور مخدوم کو غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ طبیعت ناساز ہے اس لیے شرکت نہیں کر سکوں گا۔ معافی کا طلبگار ہوں۔ خدا آپ کو ان کوششوں میں کامیاب کرے۔ غلام محمدؒ۔ (2) میر صاحب کی شخصیت میں اتنی وسعت ہے کہ یہ تحریر اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ایک تشنگی رہ جائے گی، اور یہ تشنگی کسی تحقیقی تھیسز کے بعد ہی ختم ہو سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ 1932 کی سردیاں زیریں سندھ اور خاص کر ٹنڈو باگو کے لیے بہتر ثابت نہیں ہوئیں۔ پیار علی جعفری، جو لارینس مدرسہ کے شاگرد تھے اور ان دنوں کراچی میں اپنے شب و روز گزار رہے ہیں، (ھھڑا مانجھی مرنا ناھن) میں اپنی تحریر میں لکھتے ہیں: "سردیاں تھیں، 12 فروری 1932 کو میں اسکول میں تھا، اور ہم پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں میر صاحب کا ملازم چیختا پکارتا آیا۔ میر صاحب ہم کو چھوڑ گئے تھے۔ سارے لوگوں کو میں نے روتے پیٹتے دیکھا۔ ایک قیامت برپا تھی۔ جو سنتا وہ سر پیٹنے لگتا۔"

میں نے 1932 کا کیلینڈر دیکھا، وہ جمعے کا دن تھا۔ میں میر صاحب کی رہائش گاہ پر گیا، جہاں میر صاحب نے 1932 میں جمعہ کے دن اپنے گھر کی چھت کو آخری بار دیکھا تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی، سرخ اینٹوں کی چار دیواری، چار دیواری کے اندر ایک خستہ سے گھر کے اجڑے ہوئے نشانات۔ خاردار جھاڑیاں اور خاموشی اب اس عظیم انسان کے گھر کے آنگن میں اُگتی ہیں۔ میں خاموش رہا۔ میر صاحب کی رہائش گاہ کی یہ حالت دیکھنے کے بعد کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ شام ہونے کو آئی تھی، اور مجھے واپس لوٹنا تھا لیکن میں ٹنڈو باگو کو اس فرشتے جیسے انسان کی آخری آرامگاہ پر حاضری دینے سے پہلے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ آنکھیں تر ہو گئیں۔ امی صحیح کہتی تھیں۔ آسمان سے نیکیاں کرنے کے فرشتے زمین پر آتے ہیں۔ مضمون میں ابتدائی طور پر نتھومل موروانی کو کتاب (ھھڑا مانجھی مرنا ناھن) کا مصنف قرار دیا گیا تھا، جبکہ یہ کتاب (بھون سندھی) کی مرتب کردہ ہے۔ تصحیح کر دی گئی ہے، اور ادارہ غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔

(1) تالپوروں نے جو بھی بستیاں بسائیں ان کو (ٹنڈو) کے نام سے پکارا جاتا ہے، جیسے: ٹنڈو باگو، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈو حیدر وغیرہ۔

(2) کتاب (جنم گذاریم جن سین) از جی ایم سید۔ ناشر سندھی ادبی بورڈ، جامشورو۔

❁❁❁

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

شعبہ پاکستان

مظہر برلاس کا ناقابل اشاعت کالم

تحریر: ڈاکٹر توصیف احمد خان

موجودہ حکومت کو قائم ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دوپہر میں ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کو مل کر نکلا تو راہداری میں چند ڈرائیوروں نے مجھے گھیر لیا، کہنے لگے ''ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، ہمیں مختلف محکموں میں نوکری کرتے ہوئے کئی برس بیت گئے، ہماری تنخواہیں بیس تیس ہزار ہیں جبکہ سپریم کورٹ کے ڈرائیوروں کی تنخواہیں لاکھوں میں ہیں، کیا یہ انصاف ہے؟'' وہاں سے آواز اٹھانے کا وعدہ کر کے نکلا مگر گہری سوچوں میں کھو گیا کہ یہ کیسا نظام ہے جہاں ایک ہی سطح کے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اتنا بڑا فرق ہے کہ ایک کی تنخواہ ہزاروں میں اور دوسرے کی تنخواہ لاکھوں میں حالانکہ رتبے کے اعتبار سے دونوں کی حیثیت ایک جیسی ہے۔ پھر مجھے وہ تمام لوگ یاد آنے لگے جن کے حق میں ہائیکورٹ یا سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا مگر ان پر عملدرآمد نہ ہو سکا پھر سوال اُبھرا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کیوں کا جواب آیا کہ جہاں عدالتیں عملدرآمد کروانا چاہتی ہیں، وہاں عملدرآمد ہو جاتا ہے اور جہاں عملدرآمد ضروری نہیں سمجھا جاتا وہاں بس فیصلہ تھما دیا جاتا ہے۔ جیسے اردو کو سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ ہے۔ خواتین و حضرات! پچھلے بارہ سال سے سیاسی حکومتوں نے صرف بدنامی کمائی، سیاسی پارٹیاں بے عزت ہوئی ہیں، ملک پر عملاً عدلیہ حکومت کر رہی ہے۔ سیاسی حکومتوں کے ہر فیصلے کو عدالتوں میں گھسیٹا جاتا ہے، جس کو بے عزت کرنا مقصود ہو، اسے بے عزت کر دیا جاتا ہے، جسے اقتدار سے محروم کرنا ہو، اسے محرومی عطا کر دی جاتی ہے۔ کسی کے مقدر میں صرف محرومی آتی ہے تو کسی کے نصیب میں نااہلی بھی لکھ دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ یوسف رضا گیلانی سے شروع ہوا، راجہ پرویز اشرف کو بھی عدالتیں بلاتی رہیں، نواز شریف کو محرومی اور نااہلی ملی، شاہد خاقان عباسی کی بھی حاضریاں لگتی رہیں، اب عمران خان کی باری ہے۔ ہمارے سیاست دان فوج کو بدنام کرنے پر لگے ہوئے ہیں، انہیں یہ ادراک ہی نہیں کہ ان کے اقتدار میں عملاً حکومت عدلیہ ہی کرتی رہی ہے۔ ہائیکورٹ کے احاطہ میں ہوائی فائرنگ ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہاں قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ڈرائیوروں کی تنخواہوں میں اتنے بڑے فرق کو جب وسیع پیمانے پر دیکھا تو پتا چلا کہ جو سول بیوروکریٹ یا آرمی افسر تیس پینتیس سال قوم کی خدمت کرتا ہے اسے ماہانہ پنشن تقریباً ایک لاکھ سے لے کر دو ڈھائی لاکھ تک ملتی ہے مگر جج صاحب خواہ پانچ سال ہی سروس کریں انہیں ماہانہ پنشن آٹھ سے دس لاکھ ملتی ہے۔ اتنی کم سروس کا اتنا بڑا معاوضہ، ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہوں گی۔ ویسے تو ہمارے ہاں اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی سروس ہوتی ہی بارہ سے پندرہ سال ہے، کسی کی اٹھارہ سال ہو گئی تو کوئی بڑی بات نہیں، دس لاکھ ماہانہ پنشن کے ساتھ دیگر بہت سی مراعات بھی جج صاحبان کو مل جاتی ہیں۔ یہ سہولتیں تاحیات دی جاتی ہیں۔ کوئی چیف سیکرٹری یا آرمی چیف ریٹائر ہو، ان دونوں کی ماہانہ پنشن کو اگر جمع بھی کر لیا جائے تو وہ ایک جج کی پنشن سے کہیں کم بنتی ہے۔ یہی حساب تنخواہوں کا ہے، یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ ججز اپنی تنخواہیں بڑھاتے وقت کسی سے نہیں پوچھتے، وزارتِ خزانہ کو بھی اطلاع ہی ملتی ہے۔ ججز اپنی تنخواہیں خود بڑھاتے ہیں۔ آپ کو ایک اور بات پر بھی حیرت ہوگی کہ اعلیٰ عدلیہ اور نچلی عدلیہ کے ججوں کی عزت میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ یعنی نچلی عدلیہ کے ججز امتحان پاس کر کے آتے ہیں، انٹرویو دے کر آتے ہیں، انہیں عدالتوں میں تھپڑ بھی مارے جاتے ہیں تو توہینِ عدالت نہیں ہوتی مگر اعلیٰ عدلیہ کے ججز کے سامنے اگر کسی کو چھینک بھی آ جائے تو توہین عدالت ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ عدلیہ کے ججز کوئی امتحان دیئے بغیر جج بنتے ہیں، ان کا تو شاید انٹرویو بھی نہیں ہوتا۔ بس جج بننے کیلئے سماجی و سیاسی روابط کا ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے انصاف کی فراہمی میں ہمارا نمبر 121 واں آیا ہے جبکہ آخری نمبر 128 ہے۔ میں نے حکمرانوں کو بارہا یہ تجویز دی ہے کہ فیڈرل سروس میں جہاں فارن سروس ہے، انفارمیشن سروس ہے وہاں جوڈیشل سروس بھی ہونی چاہئے۔ جیسے فوج میں آرمی چیف بننے کیلئے سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہونا ضروری ہے، آئی جی پولیس بننے کیلئے اے ایس پی بننا ضروری ہے یا چیف سیکرٹری، پرنسپل سیکرٹری بننے کیلئے مجسٹریٹ درجہ دوم یا اسسٹنٹ کمشنر بننا ضروری ہے۔ اسی طرز پر مقابلے کا امتحان ہو، چیف جسٹس بننے کیلئے سروس کا آغاز بطور سول جج ہونا چاہئے۔ اس سے انصاف میں بھی بہتری آئے گی اور کسی کا حق بھی نہیں مارا جائے گا، یہ بھی نہیں ہوگا کہ فلاں چیمبر کے اتنے جج بن گئے ہیں اور فلاں سیاسی پارٹی نے فلاں فلاں ہائیکورٹس میں اتنے جج بنوا لئے ہیں۔ ہماری عدلیہ کی تاریخ میں جسٹس ایم آر کیانی، جسٹس کارنیلیس اور جسٹس دراب پٹیل کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ کبھی کسی نے سوچا کہ وہ مقابلے کا امتحان دے کر جوڈیشل سروس کا حصہ بنے تھے؟ اس زمانے میں یہ آپشن دیا جاتا تھا کہ آپ ایگزیکٹو میں جانا چاہتے ہیں یا جوڈیشل سروس میں۔ جو اب ہو رہا ہے اس طرح نہیں ہوتا تھا۔ تازہ ترین مثال لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کی ہے جنہوں نے لسٹ دے کر پھر واپس لے کر ججز کے انتخاب پر نیا سوال کھڑا کر دیا ہے۔ یہ لسٹ محض اس لئے واپس لی گئی کہ اس میں کئی افراد کے بھتیجوں اور بھانجوں کا نام شامل تھا۔ اب اس پر خود عدلیہ کو غور کرنا چاہئے۔ اپنی تنخواہوں اور مراعات پر بھی غور کرنا چاہئے، کیا یہ سب انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہے، کیا تمام سرکاری ملازمین کی تنخواہیں ان کے درجوں کے حساب سے ایک جیسی نہیں ہونی چاہئیں۔ کیا ایک غریب ملک میں تنخواہیں اور مراعات صدر اور وزیراعظم سے بھی زیادہ وصول کرنا جائز ہے؟ عطاالحق قاسمی یاد آ جاتے ہیں کہ

ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہئے

1992ء کا ورلڈ کپ

تحریر: رؤف کلاسرا

ایک وقت آتا ہے جب ہر حکمران کو محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ کر کے دیکھ لیا لیکن بات نہیں بن رہی تو پھر ایسا کیا کیا جائے کہ عوام واہ واہ کر اٹھیں اور جن مسائل کا وہ شکار ہیں ان سے وقتی طور پر اُن کی توجہ ہٹ جائے؟ سب کو شوق ہوتا ہے کہ عوام کو لگے کہ وہ عوامی حکمران ہیں۔ جنرل ضیا کو لگا کہ وہ سائیکل پر سوار ہو کر عوام کو پیغام دیں کہ وہ کتنے سادہ اور عام انسان ہیں' نواز شریف کو شوق چرایا کہ وہ عوام میں جا کر کھلی کچہریاں منعقد کیا کریں۔ شاید انہیں لگا ہو کہ اگلے زمانوں میں بادشاہ ایسے دربار لگاتے تھے۔ نواز شریف نے سوچا ہوگا کہ وہ اس شاہی روایت کو دوبارہ شروع کریں۔ فیصل آباد میں ایک ایسی کھلی کچہری میں ایک افسر کو موقع پر نواز شریف نے ہتھکڑی لگوا دی تھی' بعد میں سپریم کورٹ کے حکم پر اسے رہا کیا گیا۔ وہی نواز شریف لندن میں ہر آنے جانے والے کو بتاتے تھے کہ کیسے جنرل محمود اور جنرل اورکزئی نے 12 اکتوبر 1999ء کو انہیں وزیراعظم ہاؤس سے گرفتار کر کے ان کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر ایک جہاز پر کراچی بھیج دیا تھا۔ نواز شریف کو ہوسکتا ہے کبھی محسوس ہوا ہو کہ شاید وہ کرما تھا جس نے ان سے انتقام لیا' کہ انہوں نے ایک افسر کو ہتھکڑی لگوائی اور بعد ازاں خود وزیراعظم ہاؤس سے گرفتار ہوئے اور ہتھکڑیاں لگیں۔

جنرل مشرف کو شوق ہوا کہ ٹی وی پر لائیو کالز لی جائیں تا کہ عوام کو محسوس ہو کہ بادشاہ سلامت ان سے براہ راست مخاطب ہیں اور وہ بات کر رہے ہیں۔ اب خان صاحب کو سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ ایسا کیا نیا کریں کہ ان پر بڑھتی ہوئی تنقید کو کم کیا جا سکے۔ ان کو یہ بھی یقین ہے کوئی بھی ہو' وہ اسے اپنی گفتگو اور لاجک سے چارم کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے وزیراعظم بن گئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جو Edge انہیں اپوزیشن میں ملا ہوا تھا وہ اب حکومت میں بھی ملے گا اور وہ جب چاہیں گے عوام کو مطمئن کر لیں گے۔ اس لیے پہلے تو انہوں نے ٹی وی اینکرز سے ملاقاتیں شروع کیں۔ اینکرز کو یہ کہا کہ ان پر پہلے سو دن تنقید نہ کریں' پھر چھ ماہ' پھر سال اور پھر پانچ سال۔ جب خان صاحب کو لگا کہ پرانا چارم اب کام نہیں کر رہا اور اینکرز اور صحافی کچھ ایسے سوالات کرنا شروع ہو گئے ہیں جن کے ان کے پاس جوابات نہیں تو انہوں نے اینکرز سے ملاقاتیں بند کر کے کہا کہ اب درجہ دوم اینکرز کو بلایا جائے۔ دو تین دفعہ بات بنی لیکن پھر وہی مسئلہ کہ وہ اینکرز بھی خان صاحب کی بات نہ سمجھ پائے۔ چارم وہاں بھی کمزور پڑ گیا۔ فیصلہ ہوا کہ اینکرز کو پرے کریں کیوں نہ چینل کے ڈائریکٹرز نیوز اور پروگرامز کو بلایا جائے' ان پر چارم استعمال کیا جائے۔ پھر پروگرامز کے پروڈیوسرز کی باری لگی۔ اب سوچا گیا اب نیا کیا کریں؟ اچانک خیال آیا کہ سوشل میڈیا ایکٹوسٹس کو بلا لیتے ہیں تا کہ وہ سوشل میڈیا پر لگے رہیں۔ ان بے چاروں کو چائے تک نہ پوچھی گئی۔ جو سارا دن خان صاحب کیلئے زمین آسمان ایک کیے ہوئے تھے وہ مایوس لوٹے کہ بندہ چائے ہی پوچھ لیتا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ اب یوٹیوبرز کو بلا کر چارم ان پر چلایا جائے۔ ان سے ملاقاتیں بھی ہوگئیں تو سوچا گیا اب کیا نیا کیا جائے؟ تو میرے جیسے کسی سیانے نے کہا' سر جی عوام سے براہ راست بات کریں' ان کی فون کالز لیں۔ یوں اب عوام سے براہ راست بات کی گئی' لیکن ایک بات کا خیال رکھا گیا کہ کالز لائیو نہیں ہوں گی بلکہ ریکارڈ کر کے انہیں اچھی طرح ایڈیٹ کیا جائے گا تا کہ کوئی ایسا سوال نہ چلا جائے جو بعد میں مسئلہ بنا دے۔ اس معاملے کو ہینڈل کرنے کیلئے درجن بھر وزیر اور افسران بھاگ دوڑ میں لگ جاتے ہیں۔

یوں وزیراعظم کے اس لائیو شو کے نام پر ریکارڈ کیے گئے پروگرام میں کوئی ایسا سوال نہ تھا جس پر وزیراعظم کے ماتھے پر پسینہ آتا یا انہیں لگتا کہ عوام کن مشکلات کا شکار ہیں اور پانی اب ناک سے اوپر ہونے لگا ہے۔ وہی سوالات سامنے آئے جن سے وزیراعظم کو تکلیف نہ ہو' تاہم ایک سوال مزے کا تھا کہ جناب آپ خود وزیراعظم ہیں اور کرکٹر ہیں لیکن آپ کے دور میں ہی کرکٹ تباہ ہوگئی ہے۔ عمران خان صاحب نے وہی پرانی بات دہرائی کہ سب چیزیں ایک دن میں ٹھیک نہیں ہوسکتیں' وقت لگتا ہے' برسوں کا گند ہے سمیٹنے میں وقت لگے گا۔ اب سوال یہ ہے کیا واقعی عمران خان کرکٹ کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ واقعی چاہتے ہیں کہ 1992ء ورلڈ کپ ٹیم کے بعد کوئی اور کپتان بھی ورلڈ کپ جیتے' جیسے وہ جیتے تھے' یا یہ اعزاز صرف ان کے نام کے ساتھ جڑا رہنا چاہیے کہ ایک ہی کپتان تھا جو ورلڈ کپ لایا؟

عمران خان صاحب کے دور میں بورڈ اور ٹیم جن لوگوں کے حوالے کئے گئے ان میں کوئی بھی پروفیشنل کوچ نہیں ہے۔ ابھی جس کو کرکٹ ٹیم کا سلیکٹر لگایا گیا ہے اس کو شاید ہی پاکستان میں کوئی جانتا ہو۔ وقار یونس نے کبھی کوچنگ کورس نہیں کیا' جیسے عاقب جاوید نے کہا ہے کہ کمنٹری باکس سے اُٹھ کر کوچ لگ جاتے ہیں' کوچنگ سے اُٹھ کر کمنٹیٹر اور اگر دونوں کام نہ ہوں تو وہ آسٹریلیا میں بنائے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ کسی اور ٹیم کی کوچنگ نہیں کی۔ مصباح الحق کا سب کو علم ہے وہ اچھے کھلاڑی ضرور تھے لیکن اچھے کوچ نہیں نکلے۔ نہ کوئی بیٹسمین ڈھونڈ سکے نہ باؤلر اور جو حالت باؤلنگ' بیٹنگ کی نیوزی لینڈ میں ہوئی وہ سامنے ہے۔ وسیم اکرم اور وقار یونس پر الزام لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے بعد کوئی باؤلر پیدا نہیں ہونے دیا۔ شعیب اختر کے ساتھ جو بدترین سلوک وسیم اکرم نے کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ عامر سہیل نے اس بارے میں لب کشائی کی اور اپنے ایک انٹرویو میں بہت اہم سوالات اٹھائے تھے۔ عامر سہیل کا کہنا تھا' پاکستان کو جان بوجھ کر 1992ء کے بعد کرکٹ ورلڈ کپ نہیں جیتنے دیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان 1996ء' 1999ء اور 2003ء کے ورلڈ کپ جیت سکتا تھا لیکن ایک کھلاڑی نے نہیں جیتنے دیے اور اس طرح کے حالات ٹیم کے اندر پیدا کیے گئے کہ یقینی جیت کو بھی ہار میں بدل دیا گیا۔ مقصد وہی تھا کہ بس پاکستان میں ایک ہی ٹیم بنی تھی جو 1992ء کی تھی۔ اس سے پہلے نہ کوئی ٹیم تھی' نہ کپتان' نہ اس کے بعد ایسی ٹیم بنے گی۔ عامر سہیل کا کہنا تھا کہ اس سلسلے میں تحقیقات ہونی چاہئیں کہ کون اس کھلاڑی کو استعمال کر رہا تھا اور ڈوریں ہلا رہا تھا کہ پاکستان 1992ء کے بعد ورلڈ کپ نہ جیت سکے اور اس کا فائدہ کس کو ہوا؟ عامر سہیل نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جس نے ورلڈ کپ نہیں جیتنے دیے' اس کی انہی "خدمات" کے صلے میں اسے صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

بہرحال ڈھائی سال میں جو کرکٹ ٹیم کی حالت ہوگئی ہے اور جس طرح بورڈ اور ٹیم مینجمنٹ کے عہدے دار چنے گئے ہیں اس سے عامر سہیل کی باتوں میں کچھ وزن لگتا ہے کہ کوئی نہ کوئی' کہیں نہ کہیں بیٹھ کر یہ پلاننگ کرتا رہا ہے اور ابھی تک کر رہا ہے کہ 1992 کی ٹیم' کپ اور کپتان کو ہی یاد رکھا جائے۔ عمران خان صاحب یہ بات نہیں سمجھ رہے کہ ان کے وزیراعظم بننے میں ورلڈ کپ کا ہاتھ ہے' کرکٹ پاکستانیوں کا جنون ہے اور ان کے دور میں ہی کرکٹ ٹیم نیچے گئی ہے۔ ہر بات پچھلوں پر ڈال دینے سے کام نہیں چلے گا۔ وزیراعظم بن کر انہوں نے ایسے لوگوں کو بورڈ اور کرکٹ ٹیم میں لگوایا ہے جو اسے روز بروز نیچے لے جا رہے ہیں۔ عامر سہیل کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ عمران خان صاحب کو اس کھلاڑی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے 1992ء کے بعد کوئی ورلڈ کپ نہیں جیتنے دیا۔ بشکریہ روزنامہ دنیا

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکو مینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکو مینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،..... ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

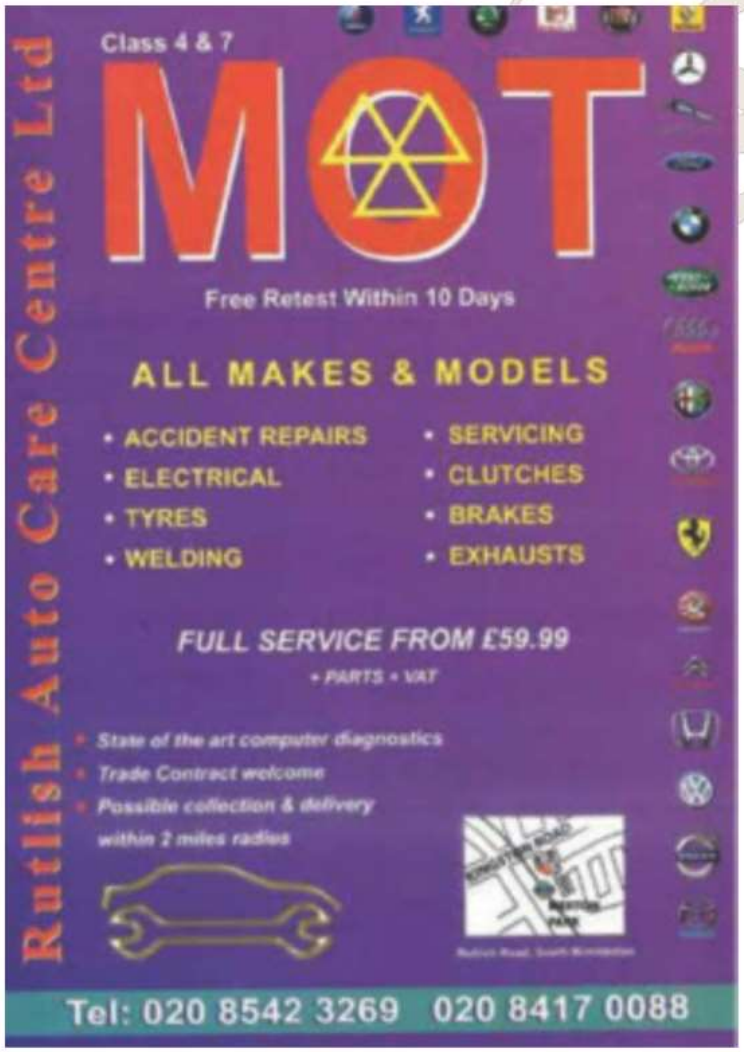

کشمیری نوجوان جو کھلونا پستول کی مدد سے انڈین طیارہ لاہور لے آئے

تحریر: شاہد اسلم

جنوری کی ایک سرد صبح ہے اور پورا شہر برف میں لپٹا ہوا ہے۔ دو کم عمر نوجوان ایک بریف کیس ہاتھ میں لیے 26 دیگر مسافروں سمیت ایک چھوٹے فوکر طیارے میں سوار ہوتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں یہ طیارہ فضا میں بلند ہو جانب منزل گامزن ہو جاتا ہے۔

طیارے میں ساتھ ساتھ بیٹھے اِن دونوں نوجوانوں کا سفر بے چینی کے عالم میں گزر رہا ہے، مگر اس بے چینی کے باوجود وہ آپس میں محو گفتگو ہیں۔ طیارہ اب اپنی منزل کے انتہائی قریب ہے اور لینڈنگ سے چند ہی لمحے قبل ایئر ہوسٹس تمام مسافروں سے سیٹ بیلٹ باندھنے کی گزارش کرتی ہے۔ مگر اسی اثنا میں ان میں سے ایک نوجوان دوڑتا ہوا کاک پٹ میں داخل ہوتا ہے اور کپتان کی کنپٹی پر پستول رکھ کر طیارے کا رُخ کسی اور ملک کی طرف موڑنے کو کہتا ہے۔ اسی دوران دوسرا نوجوان ہینڈ گرنیڈ ہاتھ میں تھام کر مسافروں کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور انھیں تنبیہہ کرتا ہے اگر کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہ ہینڈ گرنیڈ چلانے سے گریز نہیں کرے گا۔ بظاہر یہ دونوں نوجوان ایک کھلونا پستول اور لکڑی سے بنے ہینڈ گرنیڈ کی مدد سے طیارے کو ہائی جیک کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسے زبردستی ایک پڑوسی ملک لے جاتے ہیں جہاں وہ جیلوں میں قید اپنے کچھ ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے یہ مناظر ہالی وڈ کی کسی ایکشن تھرلر فلم کے ہیں لیکن ایسا نہیں کیونکہ یہ مناظر آج سے 50 برس قبل پیش آنے والے طیارہ ہائی جیکنگ کی اُس واردات کے ہیں جس کے متعلق بہت سے سوالات اور ابہام کئی دہائیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی جواب طلب ہیں۔ 50 سال قبل یعنی 30 جنوری 1971 کو دو کشمیری نوجوانوں، چیئرمین جموں کشمیر ڈیموکریٹک لبریشن پارٹی محمد ہاشم قریشی اور ان کے دور کے رشتہ دار اشرف قریشی، نے ایک انڈین فرینڈشپ فوکر طیارہ (گنگا) کو سرینگر ایئرپورٹ سے جموں جاتے ہوئے ہائی جیک کر لیا اور بعد میں اسے زبردستی پاکستان کے شہر لاہور لے گئے۔

ہاشم قریشی کی عمر اس وقت فقط ساڑھے 17 سال جبکہ اشرف قریشی کی عمر 19 سال تھی۔ گنگا جہاز سروس سے ریٹائر ہو چکا تھا لیکن ہائی جیکنگ کی اس واردات سے محض چند ہفتے قبل اچانک اسے دوبارہ اڑان بھرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

طیارہ ہائی جیکنگ کی اس واردات کے پیچھے ممکنہ عوامل اور اس ہائی جیکنگ کے مستقبل پر اثرات کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہائی جیکنگ کا یہ منصوبہ کب اور کیسے بنا؟

طیارہ ہائی جیکنگ کا منصوبہ کب اور کس نے بنایا؟

سنہ 1968 میں جب جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین اور کشمیر کی آزادی کے لیے چلائی جانے والی مسلح تحریک کے روح رواں مقبول بھٹ کو انڈیا کے ایک افسر امر چند کے قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تو وہ جیل توڑ کر پاکستان کے زیر انتظام کشمیر بھاگ آئے۔ اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد 16 سال کا ایک نوجوان ہاشم قریشی بھی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ملنے پاکستان آیا۔ پشاور میں اپنے قیام کے دوران ہاشم قریشی کی ملاقات مقبول بٹ سے ہوئی۔ مقبول بٹ سے متاثر ہو کر ہاشم نے جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔ اس تنظیم کا مقصد کشمیر کو پاکستان اور انڈیا دونوں سے آزاد کروانا تھا۔ اس جماعت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے یہ نوجوان انڈیا کے زیر انتظام کشمیر کے علاقے سرینگر واپس چلا گیا۔ کچھ ماہ بعد یہ نوجوان سیالکوٹ کے راستے دوبارہ پاکستان آیا لیکن اس مرتبہ پاکستان میں داخل ہونے کا جو اس نے طریقہ اپنایا وہ غیر قانونی تھا جس میں معاونت خود انڈیا کی بارڈر سکیورٹی فورس (بی ایس ایف) کے ایک اہلکار نے کی، جو ہاشم قریشی کو لال چوک سرینگر میں ملا اور بارڈر پار کروانے کے بدلے میں مقبول بٹ کے متعلق معلومات لینا چاہتا تھا۔ بی ایس ایف کی مدد سے بارڈر عبور کرنے کے بعد ہاشم قریشی مقبول بٹ سے ملے اور آئندہ کا لائحہ عمل طے ہونے لگا۔ 18 جون 1969 کو مقبول بٹ، ہاشم قریشی اور امان اللہ خان ڈاکٹر فاروق حیدر کے گھر راولپنڈی میں کھانے کی میز پر جمع تھے کہ اچانک ریڈیو پر خبر نشر ہوئی کہ اریٹریا کی آزادی کی جنگ لڑنے والے تین نوجوانوں نے ایتھوپیا کے مسافر

طیارے پر ہینڈ گرنیڈ اور ٹائم بموں سے حملہ کر دیا ہے کیونکہ ایتھوپیا نے اس وقت اریٹریا پر قبضہ کیا ہوا تھا اور وہاں آزادی کی مسلح تحریک چل رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے مقبول بٹ کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا کہ انھیں بھی اپنی آزادی کی آواز پوری دنیا میں پہنچانے کے لیے کچھ ایسا ہی منصوبہ بنانا چاہیے اور ایک طیارہ اغوا کرنا چاہیے۔ سرینگر میں موجود ہاشم قریشی نے بی بی سی کے ساتھ خصوصی گفتگو کرتے ہوئے بتایا چونکہ اُس مجلس میں موجود چار لوگوں میں سب سے کم عمر اور نوجوان وہ تھے اس لیے مقبول بٹ نے انھیں دیکھتے ہوئے پوچھا کہ ہاشم کیا تم یہ کرلو گے؟

(کیوں نہیں، میں کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی جان تک قربان کرسکتا ہوں) ہاشم قریشی کے اس جواب پر اسے خوب داد ملی جس کے بعد طیارہ ہائی جیک کرنے کا منصوبہ ترتیب پانے لگا۔ جب منصوبہ بن گیا تو ہاشم قریشی کو طیارہ ہائی جیک کرنے کی تربیت دینے کے لیے ڈاکٹر فاروق حیدر کے برادر نسبتی جاوید منٹو کا انتخاب ہوا جو ایک سابقہ پائلٹ تھے۔ جاوید منٹو فوکر جہاز کے متعلق تمام معلومات دینے کے لیے، یعنی پائلٹ کہاں بیٹھتا ہے، کاک پٹ میں پائلٹ کو قابو کیسے کرنا ہے اور جہاز پر سوار مسافروں کو کیسے ڈیل کرنا ہے، ہاشم قریشی کو چکلالہ ایئرپورٹ راولپنڈی اپنے ساتھ لے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ ہاشم قریشی کو ہینڈ گرنیڈ چلانے اور بم بنانے کی تربیت بھی دی گئی۔ ٹریننگ مکمل ہوجانے کے بعد منصوبے کے مطابق انھیں ایک ہینڈ گرنیڈ اور پستول کے ساتھ واپس سرینگر روانہ کر دیا گیا۔ ہاشم قریشی نے سرینگر واپسی کے لیے پھر سیالکوٹ بارڈر کا انتخاب کیا جہاں پر بی ایس ایف نے انھیں پکڑ لیا اور ان کے قبضے سے پستول اور ہینڈ گرنیڈ برآمد کر لیے۔ دوران حراست ہاشم قریشی نے بی ایس ایف اہلکاروں کو مقبول بٹ کے منصوبے کے متعلق آگاہ کر دیا کہ اسے کس طرح پاکستان میں ایک انڈین طیارہ ہائی جیک کرنے کی تربیت دی گئی ہے اور اس مشن میں سرینگر سے دو اور لوگ بھی اس کا ساتھ دیں گے۔ ہاشم قریشی کے مطابق (اصل میں سرینگر واپسی کے وقت مقبول بٹ نے بتایا تھا کہ اگر بارڈر پر پکڑا جاؤں تو انھیں اپنے مشن کے متعلق بتا دوں اور کہوں کہ میرے ساتھ دو اور لوگ بھی شامل ہیں جو سرینگر میں ہیں، اس طرح بی ایس ایس والے اسے ماریں گے نہیں بلکہ باقی لوگوں کا کھوج لگانے کے لیے اس کے ساتھ نرمی برتیں گے۔)

ہاشم قریشی بتاتے ہیں کہ بالکل ویسے ہی ہوا اور بی ایس ایف کے لیے کام کرنے پر آمادگی ظاہر کرنے کے بعد نہ صرف انھیں چھوڑ دیا گیا بلکہ انھیں یہ بھی بتایا گیا کہ انھیں بی ایس ایف میں بطور سب انسپکٹر بھرتی بھی کرلیا گیا۔ ان کے بقول یقیناً وہ (بی ایس ایف میں بھرتی) سب جعلی تھا لیکن بی ایس ایف نے دونوں مشتبہ ہائی جیکروں کی شناخت کے لیے انھیں سرینگر ایئرپورٹ پر تعینات بھی کیا جہاں وہ تسلسل کے ساتھ جاتے رہے اور جہاز میں سوار ہونے کے بارے میں مسلسل ریکی کرتے رہے تاکہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ دوسری طرف رہائی کے فوری بعد ہاشم قریشی نے اپنے دور کے رشتہ دار اشرف قریشی کو سارے منصوبے کے متعلق نہ صرف آگاہ کیا بلکہ روزانہ ورزش کے بہانے قلعہ ہاری پربت پر طیارہ ہائی جیکنگ کی تربیت بھی دیتے رہے۔ ابھی ایک اور مشکل تھی کہ چونکہ پستول اور ہینڈ گرنیڈ تو بی ایس ایف نے قبضے میں لے لیے تھے اور مقبول بٹ سے بھی دوبارہ اسلحہ نہیں پہنچ سکا تھا اس لیے اسلحے کا انتظام کیسے کیا جائے اس کے لیے ہاشم قریشی نے ایک اور منصوبہ بنایا۔ ان دنوں سرینگر میں اخبارات میں ایک اشتہار آتا تھا کہ چور اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اصل جیسی نظر آنے والی پستول خریدیں۔ ہاشم قریشی بتاتے ہیں کہ اخبار میں اشتہار پر دیے گئے پتہ پر انھوں نے ایک پستول کا آرڈر دے دیا اور قریبی ایک دکان کا پتہ لکھوا کر وہاں منگوا لیا۔ دس بارہ دن بعد وہ نقلی پستول موصول ہوگئی جس پر جب کالا رنگ کیا گیا تو وہ ایسے ہی نظر آنے لگی جیسے اصلی ریوالور ہو۔ اب ہینڈ گرنیڈ کا کیا کیا جائے۔ اس کے لیے ہاشم قریشی نے کاغذ پر اشرف قریشی کو ہینڈ گرنیڈ کی تصاویر بنا کر دکھائیں کہ وہ کس طرح کا دکھائی دیتا ہے جس پر اشرف قریشی کہنے لگے کہ یہ تو لکڑی کے (بیئرنگ) جیسا ہے، اسے ہم خود بنالیں گے، ذرا بھی مشکل نہیں ہوگی۔ چند دنوں میں ہی لکڑی کا ہینڈ گرنیڈ بھی بن گیا اور تین سے چار مختلف رنگ ملا کر لوہے کا رنگ بن گیا جسے اس کے اوپر چڑھایا گیا تو وہ بالکل اصلی ہینڈ گرنیڈ نظر آنے لگا۔ ان دنوں انڈیا کی اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کے صاحبزادے راجیو گاندھی بھی بطور پائلٹ سرینگر آتے جاتے رہتے تھے اور کچھ ایسی اطلاعات تھیں کہ راجیو گاندھی بطور پائلٹ 30 جنوری کو سرینگر آرہے ہیں۔

بقول ہاشم قریشی انھوں نے بھی 30 جنوری کا دن ہی ہائی جیکنگ کے لیے مختص کرلیا تاکہ اسی جہاز کو وہ ہائی جیک کریں جس کے پائلٹ راجیو گاندھی ہوں۔ وہ مزید بتاتے ہیں چونکہ بی ایس ایف ان پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھی اس لیے انھیں چکما دینے کے لیے جہاز میں سوار ہونے کا طریقہ یہ نکالا کہ ان کے لیے ٹکٹ اشرف نے محمد حسین کے نام سے جبکہ اشرف کے لیے ٹکٹ خود انھوں نے خریدا۔ 30 جنوری 1971 کو ہفتہ کا دن تھا اور یہ دونوں نوجوان تیار ہوکر ایئرپورٹ آگئے لیکن انھیں یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ راجیو گاندھی کسی وجہ سے نہیں آسکے لیکن منصوبے کے مطابق وہ دستیاب جہاز میں سوار ہوگئے۔ اشرف کے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں نقلی ہینڈ گرنیڈ اور پستول تھی اور وہ ان چیزوں کے ساتھ بھی باآسانی جہاز میں سوار ہوگیا کیونکہ ہاشم قریشی پہلے ہی یہ ریکی کرچکے تھے کہ مسافروں کی جہاز میں سوار ہوتے وقت کوئی خاص چیکنگ نہیں ہوتی۔

جہاز تقریباً ساڑھے گیارہ بجے سرینگر ایئرپورٹ سے جموں کے لیے اڑان بھر گیا۔ چونکہ ان دنوں سرینگر اور جموں کے درمیان آدھے، پونے گھنٹے کی فلائٹ تھی اور جیسے ہی

ایئر ہوسٹس نے یہ اعلان کیا کہ مسافر سیٹ بیلٹ باندھ لیں جہاز تھوڑی دیر میں جموں اترنے والا ہے تو ہاشم قریشی تیزی سے سیٹ سے اٹھ کر کاک پٹ میں چلے گئے اور جا کر نقلی پستول بائیں طرف بیٹھے ہوئے جہاز کے کپتان کیپٹن ایم کے کا چرو کے سر پر رکھ دی اور اسے کہا کہ جہاز کو پاکستان لے چلے۔ پائلٹ اوبرائے دائیں طرف بیٹھے تھے اور وہ بالکل بھی دیکھ نہ سکے کہ پستول اصلی ہے یا نقلی۔ جہاز اب اپنی نئی منزل کی جانب مڑ چکا تھا۔ ہاشم قریشی بتاتے ہیں کہ میرے کاک پٹ میں داخل ہوتے ساتھ ہی اشرف بھی اپنی سیٹ سے اٹھے اور ہینڈ گرنیڈ ہاتھ میں تھامے کاک پٹ کے دروازے پر چلے آئے جہاں ہم دونوں کی کمر ایک دوسرے کی طرف تھی تا کہ وہ پائلٹس کو کنٹرول کر سکیں اور اشرف سارے مسافروں کو۔ ہاشم قریشی کے مطابق اشرف نے ہاتھ میں گرنیڈ تھامے سب مسافروں کو کہہ دیا کہ وہ ہاتھ اوپر کر لیں ورنہ وہ اسے چلا دیں گے۔ جہاز میں انڈین فوج کے ایک کپتان بھی بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے اشرف سے سوال کیا کہ یہ کون سا گرنیڈ ہے جس پر اشرف نے برجستہ کہا کہ (ابھی چلا کر دکھا دیتا ہوں پھر تمھیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ کون سا ہینڈ گرنیڈ ہے جس پر وہ بھی ڈر گیا اور اس نے دوبارہ کوئی بات نہ کی۔)

(میں جہاز کو جہلم کے اوپر سے راولپنڈی لے جانا چاہتا تھا لیکن انتہائی سرد موسم اور برف باری کی وجہ سے دریا دیکھ نہ سکا۔ میں نے پائلٹ کو کہا کہ جہاز راولپنڈی لے چلے جس پر اس نے کہا کہ پٹرول کم ہے اسے ہم لاہور تک لے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ نزدیک ہے) ہاشم قریشی کے مطابق وہ جہاز کو لاہور لے جانے پر مان گئے۔ ہاشم قریشی کے بقول ایک وقت آیا جب انھوں نے نیچے آبادی دیکھی تو پائلٹ سے پوچھا یہ کہاں لے جا رہے ہو تو وہ پنجابی میں کہنے لگا (منڈیا غصہ نہ کر میں تو انوں دھوکہ نہیں دِتا، اسی لاہور ہی جاندے واں پے) یعنی نوجوان غصہ نہ کرو تمھیں کوئی دھوکہ نہیں دیا گیا، آپ کو لاہور ہی لے کر جا رہے ہیں۔

جہاز چلتا رہا پھر کچھ دیر بعد کو پائلٹ اوبرائے نے وائرلیس پر کوڈ ورڈ کے ذریعے ایئر ٹریفک کنٹرولر کو پیغام بھیجا کہ لاہور، لاہور۔ لیکن دوسری طرف سے ایک سردار صاحب کی آواز آئی کہ نہیں یہ لاہور نہیں امرتسر ہے۔ ہاشم قریشی کہتے ہیں کہ اس چالاکی پر انھوں نے ایک زوردار تھپڑ اوبرائے کو جڑ دیا کیونکہ وہ جہاز کو دھوکے سے امرتسر لے جانا چاہ رہا تھا۔ (اس کے بعد میں نے اس سے واکی ٹاکی بھی چھین لی۔)

ہاشم قریشی کے بقول پھر جیسے ہی لاہور اترنے کے لیے پاکستان کے کنٹرول ٹاور سے رابطہ ہوا تو انھیں بتایا کہ ہم دو (کشمیری مجاہدین) ہیں اور ہم نے انڈین جہاز کو ہائی جیک کر لیا ہے اور اس میں عملے کے علاوہ مسافر بھی ہیں اور ہمیں اترنے کی اجازت دی جائے۔ کنٹرول ٹاور نے متعلقہ حکام سے رابطے کے بعد اترنے کی اجازت دی اور جہاز تقریباً ڈیڑھ بجے دوپہر لاہور ایئر پورٹ پر اُتر گیا جہاں ہر طرف سکیورٹی کے لوگ تھے جنھوں نے جہاز کو گھیرے میں لے لیا۔ لاہور پولیس کے اس وقت کے ایس ایس پی عبدالوکیل خان اور ڈی ایس پی ناصر شاہ کے علاوہ سکیورٹی اور انتظامیہ کے دیگر لوگ بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ہاشم قریشی بتاتے ہیں کہ سکیورٹی کے لوگوں میں سے کچھ ہمارے پاس آئے جن سے انھوں نے پوچھا کہ (کیا یہ لاہور ہی ہے؟) انھوں نے کہا جی ہاں یہ لاہور ہی ہے۔ (میں نے کہا میں کیسے مان لوں کہ آپ لوگ سچ کہہ رہے ہیں؟)

اشرف قریشی کے بقول وہ اپنے سروس کارڈ دکھانے لگے اور پاکستان کا جھنڈا بھی دکھایا۔ (میں نے کہا یہ سب تو جعلی بھی بن سکتا ہے جس کے بعد وہ کلمہ پڑھ کر سنانے لگے جس کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم لاہور ہی میں اترے ہیں۔)

ہائی جیکروں سے مطالبات پوچھے گئے تو جواب ملا کہ انھوں نے یہ سب (کشمیر کی آزادی) کے لیے کیا ہے اور ان کے کچھ ساتھی جو انڈیا کی قید میں ہیں انھیں مسافروں اور جہاز کو چھوڑنے کے بدلے رہا کروانا ہے۔ اشرف قریشی کہتے ہیں کہ (ہمیں کہا گیا کہ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیں اور باقی لوگوں کو بیشک قید میں رکھیں جس پر میں نے جواب دیا کہ نہیں سب سے پہلے ان کی بات مقبول بٹ سے کروائی جائے۔)

سکیورٹی والے مجھے لاؤنج میں لے گئے مگر مقبول بٹ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا جس کے بعد میری بات ڈاکٹر فاروق حیدر سے کروائی گئی جو اس وقت راولپنڈی میں تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں (فیروز) ہوں اور ہم (پرندہ) لے آئے ہیں آپ لاہور آ جائیں۔ اشرف قریشی کا کوڈ نام فیروز تھا اور آپریشن کا کوڈ نام پرندہ تھا۔ طیارے کے اندر عورتیں ڈر جبکہ بچے بھوک اور پیاس کی وجہ سے رو رہے تھے۔ ہائی جیکروں کی درخواست پر انتظامیہ نے فوری پانی مہیا کیا جو مسافروں کو دیا گیا۔ ہاشم اور اشرف نے آپس میں مشورہ کر کے لینڈنگ کے دو گھنٹے کے اندر اندر عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا۔

اشرف قریشی بتاتے ہیں کہ کوئی گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے بعد سکیورٹی کے لوگ دوبارہ آئے اور کہا کہ ڈاکٹر فاروق حیدر نے پیغام بھیجا ہے کہ باقی مسافروں کو بھی چھوڑ دیں اور جہاز پر قبضہ جمائے رکھیں۔ ہم نے اُن کی بات مان لی کہ یہ تو ہم سے دھوکہ نہیں کریں گے اور شام تک سب مسافروں کو چھوڑ دیا، اب ہمارے قبضے میں صرف گنگا جہاز رہ گیا تھا۔

ہاشم قریشی کے بقول (تمام مسافروں کو رہا کر کے صرف جہاز پر قبضہ رکھنا یقیناً ایک بچگانہ بات تھی جس سے ہماری سودے بازی کی پوزیشن کمزور ہوئی لیکن تب ہم بھی تو بچے ہی تھے نا۔)

تمام مسافروں کو سخت سکیورٹی کے حصار میں لاہور کے ایک ہوٹل میں لے جایا گیا جہاں وہ چند دن ٹھہرے اور پھر انھیں انڈیا بھیج دیا گیا۔ رات نو بجے کے آس پاس مقبول بٹ، جاوید ساغر، کے خورشید اور دیگر بھی لاہور پہنچ گئے۔ ہاشم قریشی بتاتے ہیں

کہ ایئر پورٹ پر اس قدر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دو، تین مرتبہ لاٹھی چارج کرنا پڑا تا کہ لوگوں کو جہاز سے دور دھکیلا جا سکے۔

نامور قانون دان اور گنگا طیارہ کیس میں ہاشم قریشی کے وکیل عابد حسن منٹو نے بی بی سی کو بتایا کہ 30 جنوری کی شام تک ہی طیارہ ہائی جیکنگ کی خبر لاہور سمیت پورے پاکستان میں پھیل چکی تھی اور اگلی صبح تک پاکستان کے دور دراز علاقوں اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر سے بھی لوگ ایئر پورٹ پہنچ چکے تھے تا کہ ان نوجوانوں کو دیکھ سکیں جو انڈیا کا جہاز ہائی جیک کر کے لاہور لائے تھے۔ عابد حسن منٹو کے مطابق ان کی دلچسپی اس لیے بھی اس معاملے میں زیادہ تھی کیونکہ ڈاکٹر فاروق حیدر کا نام بھی اس ہائی جیکنگ میں آ رہا تھا جو ان کی ایک کزن کے خاوند تھے۔ ہاشم قریشی یاد کرتے ہوئے دعوی کرتے ہیں کہ 31 جنوری کو پاکستانی حکام نے جاوید ساغر اور ہمارے ایک اور ساتھی کو بھی جہاز کے اندر آنے کی اجازت دے دی تا کہ ہم اگر رات کو سو بھی جائیں تو یہ لوگ جہاز پر قبضہ جمائے رکھیں۔ ہاشم کے مطابق 31 جنوری کو ہی پاکستان کی سکیورٹی ایجنسی کے لوگ آئے اور جہاز میں موجود ڈاک (خطوط) لے کر چلے گئے۔ کیونکہ یہ فلائٹ دہلی سے سرینگر تک چلتی تھی اسی لیے انڈین فوج کی ڈاک ترسیل بھی اسی فلائٹ سے ہوتی تھی اور ہاشم کے بقول وہ شاید ڈاک پڑھنا چاہ رہے تھے۔ ہاشم کے مطابق اگلے روز یعنی یکم فروری کو پاکستانی فوج کے دو افسران ڈاک لے کر واپس آ گئے اور کہنے لگے اس کی سیلیں صحیح بند نہیں ہوئیں اور با آسانی پتا چل جائے گا کہ یہ کھولی گئیں ہیں اس لیے آپ اسے جلا دیں جس کے بعد انھوں نے ڈاک کو جلا کر کشمیری ڈش (وازوان) گرم کی جسے دونوں افسران سمیت ہائی جیکروں نے کھایا۔ ہاشم قریشی کے بقول اسی روز انھوں نے دو فوجی افسروں میں سے ایک کے پیٹ پر پستول رکھ کر مذاق مذاق میں کہا کہ (ہینڈز اپ) تو انھوں نے ڈر کے مارے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ (بعد میں میں نے انھیں بتایا کہ یار یہ نقلی ہے۔)

فوج کے افسر یہ سن کر حیران ہوئے اور پوچھنے لگے کہ (کیا واقعی یہ نقلی پستول ہے۔) ہاشم قریشی کہتے ہیں اس روز پہلی بار انھوں نے خود پاکستانی سکیورٹی اداروں کو بتایا کہ گنگا ہائی جیکنگ نقلی پستول اور ہینڈ گرنیڈ سے کی گئی تھی، اس سے پہلے سب بے خبر ہی تھے۔

دو فروری کو بڑے دلچسپ واقعات ہوئے

پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو جنھیں دسمبر 1970 کے الیکشن میں مغربی پاکستان سے اکثریت ملی تھی وہ عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب جنھیں مشرقی پاکستان سے اکثریت ملی تھی سے ملنے ڈھاکہ گئے ہوئے تھے تا کہ ممکنہ انتقال اقتدار پر بات کر سکیں۔ دو فروری 1971 کو جب ذوالفقار علی بھٹو ڈھاکہ سے واپس لاہور پہنچے تو انھیں بتایا گیا کہ دو کشمیری نوجوان انڈیا کا طیارہ ہائی جیک کر کے لاہور لے آئے ہیں۔ نامور سینیئر صحافی خالد حسن نے اپریل 2003 میں (فرائیڈے ٹائمز) میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ وہ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تھے۔

خالد حسین کی تحریر کے مطابق جب وہ (بھٹو) لاہور پہنچے تو عوام کی ایک کثیر تعداد اُن کے استقبال کے لیے موجود تھی جو بار بار انھیں ہائی جیکروں سے ملنے پر اصرار کر رہی تھی۔ خالد حسن نے لکھا کہ بھٹو نے خود اُن سے کہا (کہ دیکھو خالد مجھے نہیں پتا کہ یہ سب کیا ہے اور یہ کون لوگ ہیں اس لیے میں کوئی بات نہیں کروں گا) لیکن بھیڑ نے انھیں ہائی جیکروں کی طرف دھکیل دیا جہاں وہ ان سے ملے اور ان کا حال احوال بھی پوچھا۔

2 فروری کو بانی پاکستان کے سابق پرنسپل سیکریٹری کے ایچ خورشید، جو بعد میں پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے صدر بھی بنے، کو لاہور ایئر پورٹ بلایا گیا جہاں مقبول بٹ سمیت وہ ہاشم قریشی سے ملے جنھوں نے بتایا کہ انھیں کہا جا رہا ہے کہ طیارے کو آگ لگا دیں۔ اشرف قریشی کے بقول مقبول بٹ نے انھیں مشورہ دیا کہ جہاز کے شیشے توڑ کر نیچے آ جائیں کیونکہ اس کی مرمت کو چار، پانچ روز لگ جائیں گے اور اتنے دنوں تک اس واردات کے ذریعے پبلیسٹی ملتی رہے گی۔ جیسے ہی وہ ملاقات ختم ہوئی اور وہ لوگ باہر نکلے ایس ایس پی لاہور عبدالوکیل اور دوسرے سکیورٹی اہلکار ہاشم قریشی کے پاس دوبارہ گئے اور کہا مقبول بٹ نے پٹرول بھیجا ہے تا کہ طیارے کو آگ لگا دیں۔

ہاشم قریشی کے مطابق انھوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ لوگ ان سے جھوٹ بول رہے تھے اور یوں 80 گھنٹے جہاز پر قبضہ رکھنے کے بعد انھوں نے جہاز کو آگ لگا دی۔ انھیں سروسز ہسپتال لاہور لے جایا گیا جہاں وہ کچھ روز تک زیر علاج رہے۔ ہاشم قریشی کے بقول پاکستان کے ہر طبقہ فکر کے لوگ ان سے ملنے ہسپتال آتے رہے اور طیارہ ہائی جیک کرنے پہ شاباش دیتے رہے۔ جونہی ہاشم قریشی ہسپتال سے ڈسچارج ہوئے وہ مقبول بٹ سمیت دیگر قائدین کے ساتھ مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے ضلع میر پور کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں گوجرانوالہ اور راولپنڈی میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے جلوسوں کی شکل میں ان کا استقبال کیا۔ لیکن جشن کے یہ مناظر زیادہ دیر تک چلنے والے نہیں تھے۔

اس وقت کی مارشل لا حکومت نے گنگا ہائی جیکنگ کے پیچھے چھپے محرکات کا پتہ چلانے کے لیے ایک یک رکنی کمیشن تشکیل دے دیا جس کی سربراہی سندھ ہائی کورٹ کے جج جسٹس نور العارفین کو سونپی گئی۔ کمیشن نے چند دنوں کی انکوائری کے بعد رپورٹ میں لکھا کہ گنگا ہائی جیکنگ بنیادی طور پر انڈیا کی سازش تھی اور ہاشم قریشی انڈین ایجنٹ تھے جنھیں اس واردات کو انجام دینے کے لیے بی ایس ایف میں بھرتی بھی کیا گیا۔ کمیشن کے مطابق یہ سارا کچھ پاکستان پر پابندی لگوانے کے لیے کیا گیا تا کہ مشرقی پاکستان میں جاری شورش پر قابو پانے میں مشکلات رہیں۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے

نتیجے میں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی جنھیں پاکستان میں چند ہفتے قبل تک ہر طرف سے داد شجاعت مل رہی تھی وہ اچانک ریاست اور ریاستی اداروں کے لیے ناپسندیدہ چہرے بن گئے جنھیں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے مقبول بٹ، ڈاکٹر فاروق حیدر، امان اللہ خان، جاوید ساغر اور دیگر قائدین سمیت اس سازش کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا۔ بقول اشرف قریشی انھیں فروری کے آخری ہفتے میں حراست میں لیا گیا اور اہلکار انھیں ٹانڈا ڈیم یہ کہہ کر لے گئے کہ تھوڑی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ اس کے بعد ہاشم قریشی کے لیے قید و بند کا وہ سلسلہ شروع ہوا جسے تھمتے تھمتے تقریباً نو سال لگے۔ ہاشم قریشی اور اشرف قریشی سمیت دیگر قائدین پر طیارہ ہائی جیک کرنے، اسے جلانے سمیت مختلف الزامات کے تحت کارروائی کا آغاز ہوا اور کیس کے ٹرائل کے لیے ایک مخصوص عدالت تشکیل دی گئی۔ جب ٹرائل شروع ہوا تو انھیں کوئی وکیل نہیں مل پا رہا تھا جس کا حل نکالنے کے لیے ٹرائل کورٹ نے سینیئر قانون دان عابد حسن منٹو سمیت دیگر وکلا کو طلب کیا۔ عابد حسن منٹو بتاتے ہیں کہ وہ اپنے گھر تھے جب ایک روز انھیں رجسٹرار آفس سے فون آیا اور انھیں سپیشل کورٹ میں پیش ہونے کا کہا گیا۔ جب وہ کورٹ میں پیش ہوئے تو حیران کن طور پر ان کے سامنے ایک یا دو نہیں بلکہ 09 ملزمان کھڑے تھے جنھیں کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جس وکیل کی چاہیں خدمات حاصل کر لیں، جس کا انتظام ریاست کے ذمے ہوگا۔ عابد حسن منٹو کہتے ہیں کہ ہاشم قریشی نے ان کا انتخاب کیا اور پھر وہ سپریم کورٹ تک ہاشم قریشی کے وکیل کے طور پر پیش ہوتے رہے۔

دسمبر 1971 سے مئی 1973 تک کیس کا ٹرائل چلا جہاں ٹرائل کورٹ نے تمام شہادتیں ریکارڈ کرنے کے بعد ہاشم قریشی کو ہائی جیکنگ کا مرکزی ملزم قرار دیتے ہوئے انھیں جاسوسی سمیت مختلف الزام ثابت ہونے پر مجموعی طور پر 19 سال قید کی سزا دی گئی جب کہ ان کے شریک ملزم اشرف قریشی کے علاوہ مقبول بھٹ اور دیگر کو عدالت برخاست ہونے تک کی سزا دی گئی۔ عابد حسن منٹو کے عزیز اور کیس کے ایک ملزم ڈاکٹر فاروق حیدر وعدہ معاف گواہ بن جانے کی وجہ سے سزا سے بچ نکلے۔ ہاشم قریشی اس فیصلے پر آج بھی حیران ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جرم جو اشرف اور ان دونوں نے مل کر انجام دیا ان میں سزائیں مختلف کیسے؟

اشرف قریشی رہائی کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد وہیں شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے اور وہیں سے ریٹائر ہوئے جس کے بعد 2012 میں ان کی وفات ہو گئی۔ دوسری طرف ہاشم قریشی کو رہائی کے لیے ابھی مزید انتظار کرنا تھا۔ انھوں نے سزا کے خلاف اپیل دائر کی جس کا فیصلہ ہونے میں کئی سال گئے۔ سزا کے دوران ہاشم قریشی کو مختلف جیلوں میں قید رکھا گیا جن میں راولپنڈی، کوٹ لکھپت، کیمپ جیل میانوالی، فیصل آباد اور اٹک جیل شامل ہیں۔ قید و بند کے دوران ہاشم قریشی کی ملاقاتیں عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب سمیت پاکستان کے اہم سیاسی کارکنوں سے بھی ہوئیں۔ مئی 1980 میں سپریم کورٹ کے تین رکنی فل بینچ جن میں جسٹس نسیم حسن شاہ، جسٹس کرم علی اور جسٹس ریاض شامل تھے انھوں نے ہاشم قریشی کے حق میں فیصلہ دیا جس کے بعد انھیں رہائی ملی۔ رہائی کے بعد وہ کچھ سال مزید پاکستان میں رہے لیکن بعد میں بیرون ملک چلے گئے جہاں انھوں نے ہالینڈ میں مستقل سکونت اختیار کی اور سنہ 2000 میں سرینگر واپس آتے ہوئے نئی دہلی میں گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد انڈین حکام نے بھی ان پر پاکستانی ایجنٹ ہونے اور گنگا ہائی جیکنگ کا مقدمہ دائر کر دیا جس کا فیصلہ گذشتہ 20 سال گزرنے کے باوجود بھی نہیں ہو پایا جبکہ وہ اس کیس میں اب بھی ضمانت پر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کیس میں پہلے ہی پاکستان میں سزا بھگت چکے ہیں اور عالمی قوانین کے تحت ایک ہی کیس میں دو مرتبہ سزا نہیں ہو سکتی اس لیے انڈیا اس کیس کے فیصلے میں مسلسل تاخیر کر رہا ہے۔ ہاشم قریشی کہتے ہیں کہ وہ شاید واحد شخص ہوں گے جن پر انڈیا پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگاتا ہے اور پاکستان انڈین ایجنٹ ہونے کا۔ ہاشم قریشی کے بقول (یہ [ایجنٹ یا ڈبل ایجنٹ ہونے کے] الزامات بڑا مضحکہ خیز ہیں۔)

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

یوم یکجہتی اور تنازعہ کشمیر واقعات کی روشنی میں

تحریر: محی الدین عباسی سینئر صحافی و تجزیہ کار

5 فروری کا دن کشمیریوں کے ساتھ یوم یکجہتی کے طور پر پاکستان میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ 30 سالوں سے جاری ہے مسئلہ کشمیر کو 72 سال ہو چکے۔ اس ضمن میں ہر حکومت قومی و سینٹ کے اجلاس میں متفقہ طور پر قراردادوں کے ذریعہ اپنا واضح پیغام بھی دیتی آئی ہے۔ لیکن ان قراردادوں کی کوئی آئینی حیثیت نہیں ہے۔ 5 فروری 2021ء کو مظفر آباد میں آزاد جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان عارف علوی نے کہا کہ مقبوضہ کشمیر میں آبادی کے تناسب کو تبدیل کیا جا رہا ہے اور بھارت نے 33 لاکھ غیر کشمیریوں کو ڈومیسائل جاری کر دیے ہیں۔ جس کا مقصد آبادی کے تناسب کو تبدیل کرنا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم اس کو عالمی سطح پر بے نقاب کریں گے۔ اور کشمیر صرف زمین کا نہیں بلکہ اصولوں کا معاملہ ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر ہمیں عملی حقیقی اقدامات اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اور یہ کشمیریوں سے علامتی یکجہتی کوئی مؤثر حکمت عملی نہیں ہے۔ اس کا تعلق کشمیر 1990ء میں شروع ہونے والی عسکری تاریخ سے ہے۔ پاکستان میں یہ دن 5 فروری کو پہلی مرتبہ منایا گیا۔ ''قائداعظم کا فرمان ہے کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے'' امریکہ کے سابق صدر ابراہیم لنکن نے کہا ''کسی کو آزادی سے محروم رکھنا کائنات کا سب سے بڑا جرم ہے'' آیئے ہم ان زمینی حقائق اور عالمی سطح کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں ان 72 سالوں میں کیا کچھ ہوا تنازعہ کشمیر واقعات کی روشنی میں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ہر سال کے سالانہ اجلاس میں پاکستان کا نمائندہ، وزیر خارجہ یا وزیر اعظم، وہ جموں و کشمیر کے تنازعے کا ذکر اپنے خطاب میں ضرور شامل کرتا ہے۔ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کو وہ مرکزیت حاصل نہیں رہی جو کہ 60 کی دہائی تک رہی تھی۔ اس کے بعد کشمیر کے تنازعے پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل (مجلس امن) یا کسی ذیلی ادارے یا انسانی حقوق کی کونسل میں کوئی مذمتی قرارداد منظور نہیں ہوئی ہے۔ اپوزیشن کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ 19 ستمبر 2019ء کو پاکستان نے کشمیر پر قرارداد میں جمع نہیں کرائی۔ یاد رہے کہ یہ پہلا واقعہ نہیں ہے اس سے قبل 1994ء میں بے نظیر بھٹو حکومت نے بھی انسانی حقوق کی کونسل میں قرارداد جمع نہیں کرائی تھی۔ لیکن اکثریتی حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رائے شماری سے قبل ہی قرارداد واپس لے لی گئی تھی۔ اس تنازعے کی وجہ سے دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی کبھی کم کبھی زیادہ رہی ہے۔ اس کشمکش کی وجہ سے دونوں ممالک میں کشمیر ان کی خارجہ پالیسی کا اہم جُز رہا ہے۔ 1998ء میں بھی کشمیر کا ذکر اقوام متحدہ میں آیا تھا جب سلامتی کونسل میں پاکستان اور بھارت کی ایٹمی دھماکوں پر قرارداد منظور ہوئی تھی۔ قرارداد نمبر 1172 میں دونوں ملکوں سے جوہری سرگرمیوں کو روکنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس وقت سلامتی کونسل کے 5 مستقل ارکان نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تنازعہ کشمیر کو حل کرانے کی کوششیں جاری رکھیں گے۔ لیکن اب تک ایسا نہ ہو سکا پہلے بھی تنازعہ کشمیر چین کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں شامل گفتگو رہا۔ 1971ء میں بھی تنازعہ کشمیر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ضمناً اٹھایا گیا تھا جب پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ جاری تھی۔

یاد رہے اس تنازعہ کو اقوام متحدہ میں 1948ء میں بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو لے کر گئے تھے۔ جب مبینہ طور پر قبائلیوں کے حملے کے بعد جموں و کشمیر کے مہاراجہ ہر سنگھ نے انڈیا سے الحاق کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہاں جنگ کا رخ اختیار کر کے اس مجلس امن سلامتی کونسل میں چودھری سر محمد ظفر اللہ خان کے ایک اجلاس میں تقریر کے لئے سوا دو گھنٹے میسر آئے تھے۔ یہاں یہ واقعہ بیان کرنا ضروری ہے کہ

1948ء میں سر محمد ظفر اللہ خان، نواب سر حمید اللہ خان صاحب والی بھوپال کے قانونی مشیر تھے۔ اس اثناء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اور قائد اعظم کا پیغام ملا کہ وہ جلد واپس پاکستان آجائیں۔ آپ کو ایک اہم عہدہ دیا جانا ہے۔ جس پر چودھری سر محمد ظفر اللہ خان نے نواب آف بھوپال سے اجازت چاہی اور کہا کہ قائد اعظم کی خواہش ہے کہ میں جلد کراچی پہنچوں جس پر نواب صاحب نے یہ کہہ کر اجازت دی کہ پاکستان کی ضرورت اور بہبودی کو میں ترجیح دیتا ہوں لہٰذا نواب صاحب نے اپنے ذاتی چیچ کرافٹ طیارے سے انہیں کراچی روانہ کیا۔ 1948ء میں قائد اعظم کی خواہش پر انہیں پہلا پاکستانی وزارت خارجہ کا قلمدان سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد فوری طور پر قائد اعظم نے فرمایا کہ آپ برما کے جشن آزادی میں پاکستان کی نمائندگی فرمائیں اور اس کے بعد اقوام متحدہ کی مجلس امن میں قضیہ کشمیر کی پیروی کے لئے چلے جائیں۔ متذکرہ بالا بیان ہو چکا ہے کہ 1948ء میں جواہر لال نہرو اس تنازعہ کشمیر کا معاملہ مجلس امن میں خود لے کر گئے تھے۔ ان دونوں اقوام متحدہ میں برطانوی نمائندہ تو سر الیگزینڈر کیڈوگن تھے لیکن اس قضیے کی اہمیت کے پیش نظر برطانیہ کے وزیر امور کامن ولیتھ رائٹ آنریبل مسٹر فلپ نوئیل بیگر خود لندن سے برطانہ کی نمائندگی کے لئے آئے تھے۔ امریکی نمائندہ سینیٹر وارن آسٹن بھی یہ دونوں اصحاب پوری توجہ اور انہماک سے کوشاں تھے کہ مجلس امن کوئی ایسا حل تجویز کرے جس کے نتیجہ میں جلد قضیے کا پرامن تصفیہ ممکن ہو جائے۔ لہٰذا دسمبر 1948ء کے آخری ہفتے میں دونوں حکومتوں نے دونوں قراردادوں کو قبول کر لیا اس پر کمیشن نے دونوں کو دعوت دی کہ اب فیصلہ پر اتفاق ہو گیا ہے تو اب جنگ بند کر دی جائے چنانچہ یکم جنوری 1949ء کو جنگ بند ہو گئی۔

علاوہ ازیں چودھری سر محمد ظفر اللہ خان نے تنازعہ کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں بھرپور انداز میں لڑا اور کشمیر سے متعلق قرارداد پاس کروائی جس کو آج ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کے 23 سال بعد 1971ء تک اقوام متحدہ نے 17 قراردادیں منظور کیں اور ان سے متعلقہ ضمنی معاملات پر اجلاس طلب کئے علاوہ ازیں اقوام متحدہ نے دیگر طریقوں سے بھارت اور پاکستان کے درمیان ثالثی کرانے کی کوششیں بھی کیں۔ 1948ء میں تنازعہ کشمیر پر 4 قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ 1950ء میں ایک قرارداد 1952ء میں اور 1957ء میں 3 قراردادیں کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل میں منظور ہوئی تھیں۔ ان قراردادوں کے درمیان کئی مشنز تشکیل پائے لیکن کشمیریوں کا مسئلہ ابھی تک حل نہ ہو سکا۔ سابق امریکی صدر ٹرمپ بھی ثالثی کی پیش کر چکے تھے۔ اس کے بعد 1965ء میں 5 مختلف قراردادیں اور متعلقہ فیصلے منظور ہوئے اور 1971ء میں دو قراردادیں۔ یہ دونوں ممالک کے درمیان جنگ کے بارے میں تھیں ان دونوں قراردادوں کو سویت یونین نے ویٹو کر دیا تھا جس کی وجہ سے کشمیریوں کی حمایت میں قرارداد منظور نہ ہو سکی۔ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 307 جس میں کشمیر کا ضمناً ذکر ہے وہ دراصل 1971ء کی جنگ کے آغاز میں منظور ہوئی تھی اور اُس وقت کشمیر جنگ کی وجہ نہیں تھا۔ 1972ء میں شملہ معاہدہ طے پانے کے بعد بھارت نے تنازعہ کشمیر کو مستقل طور پر سرد خانہ میں ڈال دیا۔ بظاہر دنیا کی تمام لاتعلقیوں کے باوجود مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ کی دستاویزات میں اب بھی ایک حل طلب تنازعہ ہے۔ اکثر کشمیری آزادی کی بات تو کرتے ہیں لیکن انہیں اپنے مسئلہ کے لئے اقوام متحدہ سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ دونوں قراردادیں اقوام متحدہ نے منظور کی ہیں۔ اس ضمن میں اس مسئلہ کا حل اور تجویز بیان کر دیتا ہوں جو 72 سال قبل پیش کی گئی تھی جس کی تفصیل چودھری ظفر اللہ خان کی کتاب تحدیث نعمت صفحہ 541 میں درج ہے۔ علاوہ ازیں 1948ء میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے دورانِ قیام چودھری محمد علی صاحب کہتے ہیں کہ چودھری ظفر اللہ خان اور میں نے یہ مشورہ کیا کہ ہمیں ہندوستان کے اقدام کی روک تھام کے لئے اپنی فوج کو کشمیر کے محاذ پر بھیج دینا چاہئے اور اس کی اطلاع ہم نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی خدمت میں بھیج دی اور عرض کیا کہ ''کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا نیویارک میں نہیں ہوگا۔'' وزیر اعظم صاحب جو خود وزیر دفاع بھی تھے اس رپورٹ اور مشورہ پر پاکستانی فوج کو محاذ پر بھیجنے کے احکام صادر فرما دیئے اس بات کا اظہار پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم نے اپنی کئی بار تقریروں میں بھی کیا کہ پاکستان کا وزیرِ خارجہ مجلس امن سلامتی کونسل کے سامنے تو کہتا ہے کہ ہماری باقاعدہ فوج جنگ میں شامل نہیں لیکن مئی 1948ء میں ثبوت مل گیا کہ پاکستانی فوج جنگ میں حصہ لے رہی ہے۔ اس کا یہی حل ہے۔ ''یعنی جنگ'' اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں نے کچھ نہیں کرنا۔ فلسطین کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ عالمی و علاقائی سازشوں کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ انسانی بنیادی حقوق کی ہر تعریف کے مطابق بدترین ظلم و ستم ہے اور کچھ نہیں۔ کشمیر کی مسلمان آبادی ایک صدی سے زائد عرصہ تک ڈوگرہ مظالم کا شکار رہی اس کے بعد بھارتی مظالم کا شکار چلی آ رہی ہے۔ خدا تعالیٰ مظلوم کی فریاد کو سنتا ہے اور آخر کار ظالم کی گرفت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا مکافاتِ عمل کا نظام ہے جو اٹل ہے اور کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اور اس مکافاتِ عمل کے نظام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ کفر کے نظام کو تو برداشت کر لیتا ہے اور مصلحتاً چلنے دیتا ہے لیکن ظلم کے نظام کو قائم نہیں رہنے دیتا۔ اس کے بعد تو اب خدا تعالیٰ کی تقدیر ہی غالب آئے گی قوم کو چاہئے جدوجہد جاری رکھیں، دعا کریں اور انتظار کریں۔

پاکستانی صحافیوں کی تنظیم جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے سالانہ انتخابات

(ایس۔اے۔صہبائی)
(چیرمین)

JAP جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان (رجسٹرڈ) کے سالانہ انتخابات برائے 22-2021 کے مرکزی عہدیداران کا انتخابی عمل مکمل کرلیا گیا ہے۔سرپرست اعلی ڈاکٹر شاہد مسعود چیرمین ایس۔اے۔صہبائی چیف آرگنائزر مبشر لقمان صدر مجیب الرحمن شامی سیکرٹری جنرل قاسم منیر اور سیکرٹری نشرواشاعت ڈاکٹر بی۔اے۔خرم منتخب باہمی مشاورت سے دیگر تمام مرکزی عہدیداران ڈائریکٹرز اور اراکین مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔صدر پاکستان عارف علوی، وزیراعظم عمران خان، وزراء اور اپوزیشن لیڈران کی جانب سے مبارکبادیں ملیں۔

اسلام آباد (نمائندہ خصوصی): عالمی سطح پر پاکستانی صحافیوں کی نمائندہ تنظیم" جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان (رجسٹرڈ)" کے سالانہ انتخابات برائے 22-2021 کے مرکزی عہدیداران ڈائریکٹرز اور اراکین مجلس عاملہ کا چناو باہمی مشاورت سے عمل میں لایا گیا۔جسکے مطابق چیرمین ایس۔اے۔صہبائی، سرپرست اعلی ڈاکٹر شاہد مسعود، چیف آرگنائزر مبشر لقمان، صدر مجیب الرحمن شامی، سینئر نائب صدر بابر رند، محی الدین عباسی، ڈاکٹر میاں اظہر امین ۔ نائب صدر پیر سید ضیاء گیلانی، شجاح حسین پیرزادہ، ارشد ملک، امجد بوبی۔سیکرٹری جنرل قاسم منیر، سیکرٹری فنانس مس فرح ناز، سیکرٹری اطلاعات و نشریات ڈاکٹر بی۔اے۔خرم، سیکرٹری نشرواشاعت راشد نیاز، ایڈیشنل سیکرٹری میر ذوالفقار ابڑو، آفس سیکرٹری فدا حسین کھاوڑ کا انتخاب کیا گیا۔بورڈز آف ڈائریکٹرز کے لیے میاں عامر علی کو ڈائریکٹر فارن افیئرز، صغیر عالم رامے ڈائریکٹر اوورسیز، عقیل ترین ڈائریکٹر کرنٹ افیئرز، سدھیر کیانی ڈائریکٹر میڈیا افیئرز، سردار ظہیر ڈائریکٹر ڈپلومیٹک افیئرز، ڈاکٹر ملک محمد افضل آعوان ڈائریکٹر ہیلتھ سیفٹی افیئرز، سلطان رومیل ڈائریکٹر شوبز، غلام نبی کشمیری ڈائریکٹر کشمیر افیئرز، الحاج ابوالبرکات ڈائریکٹر ادبی افیئرز، امجد خان ڈائریکٹر سپورٹس، ریاض بزمی ڈائریکٹر ایجوکیشن جبکہ امجد سعید خان کو ڈائریکٹر سوشل افیئرز منتخب کیا گیا۔جرنلسٹس ایسوسی ایشن پاکستان کے اراکین مجلس عاملہ کے لیے سردار کامران آغا، شمس طبریزی، مس کبری بی بی، میڈم بندیا اسحق، سردار غلام مصطفی، ریاض چشتی، ضیاء شام، سہیل انجم، رانا زوالفقار اعجاز، شاہین ملک، اسد علی شاہ، عامر اعظم، جان محمد رمضان، جمیل ملک اور خاور ندیم زاہد کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے چیرمین ایس۔اے۔صہبائی نے نومنتخب عہدیداران، ڈائریکٹرز اور اراکین مجلس عاملہ کو مبارکباد دیتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ جرنلسٹس ایسوسی آف پاکستان کے تمام عہدیداران وممبران مثبت میڈیا کے فروغ کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہیں گے۔عالمی سطح پر پاکستان کے مثبت تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے میڈیا کے پلیٹ فارم سے اپنی تمام توانائیاں بروئے کار لاتے رہیں گے۔میڈیا کے ملک گیر معاشی بحران سے نمٹنے کے لیے ورکنگ جرنلسٹس کے لیے روزگار کے متبادل مواقع کے لیے کوششیں جاری رکھیں گے۔صحافیوں کے حقوق کی جنگ اور صحافیوں کے بچوں کے لیے سکولز یونیورسٹیز ہاوسنگ اسکیمز لائف انشورنس اور ہاسپٹلز کا قیام ہمارے منشور کا حصہ ہے۔ہمارا منشور مثبت میڈیا کا فروغ صحافتی حقوق کی بجا آوری کے لیے تمام صحافیوں کو مشترکہ پلیٹ فارم پر یکجا کرنا اور عالمی سطح پر پاکستان کے مثبت تشخص کو اُجاگر کرنا ہے۔شہدائے صحافت کے غریب خاندانوں کی کفالت کے لیے بیمہ پالیسی شادی بیاہ کے لیے بیٹی فنڈز اور بچوں کے روشن مستقبل کے لیے سکولز کالجز یونیورسٹیز اور ہسپتالوں کا قیام جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے منشور اور مشن کا حصہ ہے۔جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے روح رواں محمد نعیم شاہ نے شہدائے صحافت کے خاندانوں کی کفالت کے لیے صحافتی روزگار اور بچیوں کی شادی بیاہ کے لیے صحافتی بیٹی فنڈز کو جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے منشور اور مشن کا حصہ قرار دیا ہے۔پاکستان بھر کی تمام معروف سیاسی سماجی مذہبی اور صحافتی شخصیات نے نومنتخب عہدیداران وممبران کو دلی مبارکباد پیش کی ہے۔

بلوچستان میں تلور کا شکار: جب ضیا الحق نے سعودی شہزادے سے 'زبردستی' ملاقات کی

تحریر: محمد کاظم

یہ 1980 کی دہائی کا واقعہ ہے جب ایک سعودی شہزادے نے پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیا الحق سے ملاقات کرنے سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا مگر اس کے باوجود جنرل ضیا زبردستی شہزادے کے پاس ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ یہ ملاقات سعودی عرب نہیں بلکہ بلوچستان کے ضلع چاغی میں ہوئی تھی جہاں سعودی شہزادہ معدومی کے خطرے سے دوچار پرندے تلور کے شکار کے لیے موجود تھا۔ اس 'زبردستی' ہونے والی ملاقات کا تذکرہ بلوچستان کے سابق چیف سیکریٹری میر احمد بخش لہڑی نے اپنی کتاب 'آن دی مڈ ٹریک' میں کیا ہے۔ احمد بخش لہڑی ضلع چاغی کے دو اضلاع میں تقسیم سے قبل نا صرف ان میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ (اسسٹنٹ کمشنر) تعینات رہے بلکہ طویل عرصے تک وہ اس ضلع کے پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہے۔ 196 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ضلع چاغی کی ایک قبائلی شخصیت سردار علی جان سنجرانی کی سابق صدر کے بارے میں رائے کا تذکرہ ہے لیکن اس سے قبل مصنف نے اس دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے۔

وہ سعودی شہزادے کون تھے؟

ضلع چاغی میں دالبندین کا علاقہ اب بھی شکار کے لیے سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے شہزادوں کے لیے مختص ہے۔ سابق چیف سیکریٹری نے اپنے کتاب میں جس واقعے کا ذکر کیا ہے اس وقت یہ علاقہ سعودی عرب کے سابق سیکنڈ کراؤن پرنس اور وزیر دفاع شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز کو الاٹ کیا گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سنہ 1982-83 کی سردیوں میں جب ہجرت کرنے والا پرندہ تلور چاغی پہنچا تو سلطان بن عبدالعزیز بھی شکار کے لیے دالبندین پہنچ گئے۔ وہ چند گاڑیوں اور لوگوں کے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ ان کے ہمراہ دو سے تین سو گاڑیوں کا ایک قافلہ تھا۔ یہ گاڑیاں اور خیمے سی ون 30 طیاروں کے ذریعے سعودی عرب سے پاکستان پہنچائے گئے تھے۔ کتاب کے مصنف کے بقول شکار کے حوالے سے غیر ملکیوں کو شکار گاہیں الاٹ کرنے پر مقامی آبادی کی رائے منقسم تھی۔ بعض لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ان کو شکار کے لیے علاقے الاٹ نہیں کرنے چاہییں کیونکہ اس سے ان کی زرعی اراضی اور فصلوں کو نقصان پہنچتا تھا جبکہ ماحولیات کے تحفظ کے حامی تلور کے شکار کے مخالف گروہوں اور افراد کا کہنا تھا کہ اس سے یہ پرندہ مکمل معدومی کے خطرے سے دوچار ہو جائے گا۔ تاہم اس وقت بھی بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ ایک ہجرت کرنے والا پرندہ ہے اگر اسے یہاں شکار نہیں کیا گیا تو دوسرے علاقوں میں اسے شکار کیا جائے گا، اس لیے ہمیں اپنے خلیجی دوستوں کو زیرِ احسان رکھنے کے لیے ان کو شکار کی اجازت دینی چاہیے۔ ان لوگوں کی یہ بھی رائے تھی کہ غیر ملکیوں کی آمد سے یہاں معاشی سرگرمیوں کا آغاز ہوگا اور لوگوں کو روزگار ملے گا۔

مصنف کے مطابق اس منقسم رائے کے تناظر میں چند مخالفت کرنے والے مقامی لوگوں نے ایک سعودی شہزادے کی شکار پارٹی پر حملہ کر دیا۔ حکومت پاکستان سعودی حکام کو اس واقعے کے بعد شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز کے ذریعے مطمئن کرنا چاہتی تھی، جن کی حیثیت حکمران خاندان میں تیسرے نمبر پر تھی۔ مصنف کے مطابق سابق صدر جنرل ضیا الحق اس مقصد کے لیے شہزادہ سلطان سے ملنا چاہتے تھے لیکن وہ تذبذب کا شکار تھے۔ ایوان صدر سے متعدد فون کالز آنے کے باوجود وہ بات نہیں کر رہے تھے۔

ایک رات دیر سے سابق صدر کے ملٹری سیکریٹری کا انھیں فون آیا اور بتایا کہ وہ ذاتی طور پر شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز سے ملیں اور ان سے ضیا الحق کی ملاقات کے لیے وقت لیں۔ سابق چیف سیکریٹری کے مطابق صدر کے ملٹری سیکریٹری کے کہنے پر جب اگلے روز وہ شام کو شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز کے پاس گئے اور ان سے وقت دینے کے لیے کہا تو انھوں نے شائستہ انداز میں ان کی درخواست کو مسترد کر دیا اور کہا کہ وہ تعطیلات پر ہیں اور صدر ضیا سے ان کی ملاقات بڑے پیمانے پر پبلیسٹی کا باعث بنے گی۔ تاہم شہزادے نے کہا کہ ان کے یہاں قیام کے خاتمے

کے بعد صدر ان سے کوئٹہ یا کراچی میں ملاقات کر سکتے ہیں۔ احمد بخش لہڑی لکھتے ہیں کہ 'میں نے اس بات سے ایوان صدر کو آگاہ کیا لیکن اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ صدر کے دورے کے لیے دو ہیلی پیڈز کی تعمیر کے لیے جگہ کی نشاندہی کی جائے، جس پر میں نے دالبندین ایئر سٹرپ کے قریب ہیلی پیڈ بنانے کے لیے جگہ کا انتخاب کیا۔' سعودی اہلکاروں نے مجھ سے رابطہ کیا اور یہ کہا کہ صدر کو کہیں کہ وہ دورہ منسوخ کریں کیونکہ شہزادہ سلطان بن عبد العزیز ان کا استقبال نہیں کریں گے جس سے سفارتی اور پروٹوکول کی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ سعودی اہلکاروں کے کہنے پر میں نے ایوان صدر میں حکام سے رابطہ کیا اور انھیں اس صورتحال سے آگاہ کیا لیکن اگلے دن مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان ورکس ڈیپارٹمنٹ (پی ڈبلیو ڈی) کو یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں کی وہ شہزادے کے کیمپ کے قریب صدر کے دورے کی مناسبت سے دو ہیلی پیڈ تعمیر کر دیں۔ سابق چیف سیکریٹری کے مطابق جلد ہی جنرل ضیا الحق ایک وفد کے ہمراہ دالبندین پہنچ گئے تو شہزادے کی بجائے نچلے درجے کے سعودی اہلکاروں نے اُن کا استقبال کیا۔' جنرل ضیا الحق وہاں پہنچتے ہی شہزادے کے اس خیمے میں گئے جو کہ کھانے پینے اور لوگوں سے ملاقات کے لیے لگایا گیا تھا۔ جنرل ضیا پہلے اکیلے خیمے کے اندر داخل ہوئے جہاں سعودی شہزادے کے عملے کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ سعودی شہزادے نے صدر کو کہا کہ وہ اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اندر آنے کے لیے کہیں جس پر صدر کے ساتھ آنے والے اہلکاروں کو بھی وہاں بلا لیا گیا۔ اس طرح انھوں نے کامیابی سے صدر کے ساتھ اکیلے ملاقات سے گریز کیا۔ اس ملاقات میں دونوں کے درمیان بات چیت کا محور علاقے میں شکار کی صلاحیت بنا رہا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ جنرل ضیا کو تلور یا اس کے شکار کے متعلق زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس موقع پر ایک علاقہ جس کا نام کنڈ تھا صدر ضیا اسے ڈونگی کہتے رہے۔ جب شہزادے کے پرسنل سیکریٹری نے کہا کہ اس کا نام ڈونگی نہیں بلکہ کنڈ ہے تو صدر نے کہا کہ ہاں ہاں ڈونگی کنڈ کے قریب ہی ہے۔ اس موقع پر جنرل ضیا الحق نے شہزادے کو تحائف پیش کیے تو جواب میں شہزادے نے بھی صدر کو گفٹس کا ایک پیکٹ تھما دیا جس میں 27 سٹیزن گھڑیوں کے علاوہ ایک راڈو گھڑی بھی تھی۔ مصنف کے مطابق اس وقت کے گورنر بلوچستان جنرل رحیم الدین خان نے بھی شہزادہ سلطان بن عبد العزیز السعود سے دو مرتبہ ملاقات کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے تاہم جنرل رحیم الدین اس فہرست میں اپنا نام شامل کرانے میں کامیاب ہوئے جن کو شہزادے نے 20 ہزار ریال جیب خرچ کے ساتھ عمرے کے لیے مہمان کے طور پر دعوت دی تھی۔

سابق چیف سیکریٹری لکھتے ہیں کہ 'یہ بات دلچسپ ہے کہ وفد میں شامل وہ لوگ جن کے ناموں کے ساتھ ملک کا لاحقہ تھا سعودی عرب سے واپسی پر چھپ گئے تھے۔ بعد میں اس کی یہ وجہ معلوم ہوئی کہ ملک کے لاحقے کی وجہ سے سعودی حکام نے ان کو زیادہ پروٹوکول دینے کے علاوہ وفد کے دیگر اراکین کے مقابلے میں ان کو 40 ہزار ریال دیے اور یہ لوگ جنرل رحیم الدین کے غضب سے بچنے سے چھپ گئے تھے۔ اب اس کو حسن اتفاق کہیے کہ سعودی عرب میں بادشاہ کا سرکاری ٹائٹل ملک ہوتا ہے۔

تلور کے شکار کی مخالفت اور تنقید

بلوچستان میں جانوروں اور پرندوں کے حقوق اور ماحولیات کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کے علاوہ بلوچستان کی قوم پرست جماعتیں عرب شیوخ کو شکار گاہیں الاٹ کرنے کی مخالف رہی ہیں۔ ماضی میں بلوچستان اسمبلی کی جانب سے اس کی مخالفت میں قراردادیں بھی منظور کی گئی تھیں۔ وزیر اعظم بننے سے پہلے خود تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان بھی عرب شہزادوں کو تلور کے شکار کی اجازت دینے کے اقدامات کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ ماضی میں تحفظ ماحولیات کے بین الاقوامی ادارے آئی یو سی این سے وابستہ رہنے والے ماہر ماحولیات فیض کاکڑ کا کہنا ہے کہ 'وزیر اعظم عمران خان جب حزب اختلاف میں تھے تو یہ کہا تھا کہ ہماری سفارتکاری پرندوں کے پروں پر سفر کر رہی ہے لیکن اب ان کے دور حکومت میں بھی تلور کے شکار کے لائسنس جاری کر دیے گئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تلور ان پرندوں کی فہرست میں شامل ہے جس کی نسل معدومی کے خطرے سے دوچار ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ ہر شہزادے کو صرف 70 سے 100 تلور شکار کرنے کا لائسنس دیا جاتا ہے لیکن وہ یہاں آ کر کثیر تعداد میں تلور کا شکار کرتے ہیں۔ محکمہ جنگلات و جنگلی حیات کے ایک سابق سیکریٹری نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ جہاں عرب شہزادوں کے کیمپ لگتے ہیں وہاں محکمے کے اہلکاروں کو جانے تک نہیں دیا جاتا۔ تاہم محکمہ جنگلات کے سینیئر اہلکار اور پراجیکٹ ڈائریکٹر وائلڈ لائف بلوچستان نیاز کاکڑ نے بتایا کہ تلور کے شکار کے لیے جو قواعد و ضوابط مقرر کیے جاتے ہیں ان پر عملدرآمد کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

رواں سال اب تک عرب شہزادوں کو تلور کے شکار کے کتنے لائسنس جاری کیے گئے؟

سردیوں کے موسم میں بلوچستان کے مختلف اضلاع میں تلور کی شکار گاہیں الاٹ کی جاتی ہیں۔ ان میں چاغی، خاران، پنجگور، واشک، گوادر، کیچ، جھل مگسی، موسیٰ خیل، قلعہ

سیف اللہ اور بعض دیگر اضلاع شامل ہیں۔حکومت بلوچستان کے ایک سینیئر اہلکار نے بتایا کہ رواں سال اب تک عرب شہزادوں کو وفاقی حکومت کی جانب سے تلور کے شکار کے لیے 17 لائسنس جاری کیے گئے ہیں لیکن تاحال چار پارٹیاں شکار کے لیے پہنچی ہیں۔سو تلور کے شکار کے لیے جو لائسنس جاری کیا جاتا ہے اس کے لیے ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ رقم جمع کروانی پڑتی ہے۔تاہم سینیئر اہلکار نے بتایا کہ رواں سال جو لائسنس جاری کیے گئے ان کے حوالے سے تاحال کوئی رقم بلوچستان کے خزانے میں جمع نہیں ہوئی۔اگرچہ بلوچستان میں قوم پرست جماعتوں اور دیگر تنظیموں کی جانب سے تلور کے شکار کی مخالفت کی جارہی ہے لیکن نہ صرف تلور کے شکار کے لیے لائسنسوں کے اجرا کا سلسلہ جاری ہے بلکہ ماضی کے مقابلے میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔سابق سفارتکار اور متحدہ عرب امارات میں سفیر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے والے محمد آصف درانی کا کہنا ہے کہ شکار ایک کھیل ہے، جس طرح مارخور کے شکار کے لیے لائسنس جاری کیے جاتے ہیں اسی طرح تلور کے شکار کے لیے لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ جن جانوروں اور پرندوں کا شکار کیا جاتا ہے ان کی آبادی کو ریگولیٹ کرنے کے لیے باقاعدہ اقدامات بھی کیے جاتے ہیں۔انھوں نے بتایا کہ بالخصوص متحدہ عرب امارات کی جانب سے تلور کے تحفظ کے لیے ایک باقاعدہ پروگرام بنایا گیا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ تلور کے بے تحاشا شکار کرنے کا تاثر بھی درست نہیں ہے۔تلور کا شکار باز کے ذریعے کیا جاتا ہے جو کہ ایک وقت میں صرف ایک تلور پکڑتا ہے۔اس سوال پر کہ کیا پاکستان کی حکومتیں خلیجی ممالک کے حکمرانوں سے تعلقات کو بڑھانے کے لیے تلور کو ایک سفارتی ذریعے کے طور بھی استعمال کرتے رہے ہیں تو ان کا کہنا تھا کہ جب عرب ممالک کے پاکستان کے ساتھ تعلقات اچھے ہیں تو ان کے لوگ یہاں شکار کے لیے آتے ہیں۔انھوں نے بتایا کہ جب یہاں کچھ وقت کے لیے تلور کے شکار پر پابندی لگی تو یہ لوگ قازقستان جاتے تھے۔انھوں نے کہا کہ 'ہمارے فیصلوں میں جذباتیت زیادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ سپریم کورٹ نے تلور کے شکار کے لیے لائسنسوں کے اجرا پر پابندی کو ختم کیا۔تاہم جب یہ سوال سابق سفیر رستم شاہ مہمند سے پوچھا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ 'آپ کو مجھ سے بہتر علم ہے کہ ہمارے حکمران تلور کو سفارتی ذریعے کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ جب آپ ان سے اربوں ڈالر لیتے ہیں اور آپ کے لوگ ان کے پاس مزدوری کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں یہاں ترسیل زر ہوتی ہے تو پھر آپ کو انھیں یہاں شکار کے لیے اجازت دینی ہوتی ہے۔

❁❁❁

جرمنی میں نسل پرست انتہا پسندوں کے مسلح ہونے کا انکشاف

یورپ سے 06 FEBRUARY, 2021 برلن (نیوز ڈیسک) جرمن خفیہ ایجنسی نے کہا ہے کہ ملک میں دائیں بازو کے نسل پرست انتہا پسندوں کے پاس بڑی تعداد میں اسلحہ موجود ہے۔خبر رساں اداروں کے مطابق حکام کا کہنا ہے کہ انتہائی دائیں بازو کے 1203 افراد کے پاس اسلحہ ہے، جسے انہوں نے لائسنس لینے کے بعد خریدا۔اس سلسلے میں وزارت داخلہ کی جانب سے جاری رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ 2019ء میں اسلحہ سے لیس انتہا پسندوں کی تعداد صرف 528 تھی۔ خفیہ ایجنسی بی ایف وی کے مطابق یہ تعداد بہت کم عرصے میں دگنا بڑھ چکی ہے۔واضح رہے کہ جرمنی میں انتہا پسندوں سے متعلق یہ معلومات پارلیمان میں بائیں بازو کی اپوزیشن جماعت لیفٹ پارٹی کی خاتون رکن کے سوال کے جواب میں فراہم کی گئی ہیں، جن کے مطابق مسلح انتہا پسندوں میں شامل 17 افراد کو پہلے بھی فائرنگ کے مقدمات کا سامنا رہا ہے۔وزارتِ داخلہ کے مطابق وفاقی پولیس نے فائرنگ کے ان واقعات کو فوجداری جرائم میں شامل نہیں کیا۔دسمبر 2019ء میں پارلیمان میں اسلحہ پر بحث کے دوران لیفٹ پارٹی کے داخلی معاملات کی ماہر مارٹینا رینر نے واضح کیا تھا کہ 700 سے زائد نیو نازیوں کے پاس اسلحہ موجود ہے۔ستمبر 2020ء میں جرمن خفیہ ادارے کی رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ ملک میں تقریباً 13 ہزار دائیں بازو کے انتہا پسند موجود ہیں۔

❁❁❁

ڈاکٹر فیاض احمد علیگ "اسٹار آف یونانی میڈیسن" ایوارڈ سے سرفراز

12 فروری کو عالمی یونانی ڈے کے موقع پر دارالحکومت دہلی کے جواہر لال نہرو یوتھ سینٹرل ہال میں آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب میں ڈاکٹر فیاض علیگ کو "اسٹار آف یونانی میڈیسن" کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھیں یہ ایوارڈ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر ایس ایم جعفری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے قومی صدر پروفیسر مشتاق احمد، اور ہمالیہ ڈرگس کے مالک ڈاکٹر سید فاروق کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر فیاض احمد کا نام طبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ اب تک ان کے 70 سے زائد مقالات ہندو پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فیاض قریب دس سے زیادہ قومی و بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کر چکے ہیں۔ یونانی طب میں مہارت کے ساتھ ہی اردو زبان و ادب میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ ان کی غزلیں ملک کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر فیاض علیگ نے مدرستہ الاصلاح سرائمیر اعظم گڑھ سے فراغت کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کافی عرصہ تک ابن سینا طبیہ کالج بینا پارہ اعظم گڑھ میں بطور لکچرر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ فی الحال وہ سنسکرتی یونانی کالج متھرا میں شعبہ تحفظ و سماجی طب میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر فیاض احمد کا تعلق شیراز ہند جونپور کے مردم خیز موضع جیگہاں سے ہے۔ فی الحال ان کا عارضی قیام دیار شبلی اعظم گڑھ کے قصبہ سرائمیر میں ہے۔

اعلان تقرری

علی حسنین مسعود ایک معروف نوجوان سماجی شخصیت، سکرپٹ رائٹر اور پاکستان کی سب سے بڑی شجرکاری کی تنظیم میک پاکستان گرین کے بانی ہیں اور پاکستان کی تعمیر ترقی کیلئے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ محترم علی حسنین مسعود کی تقرری بطور بیورو چیف سینٹرل پنجاب ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل لندن برائے سال یکم مارچ 2021ء تا 2022ء عمل میں لائی جا رہی ہے۔ جو کہ ادارہ کے لیے صد افتخار ہے۔ تمام سرکاری و غیر سرکاری ادارے نوٹ فرمالیں اور ان سے تعاون کریں۔ موصوف ایک سماجی شخصیت ہیں اور سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں اور خود بھی قومی و بین الاقوامی سطح کے پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ نامور شخصیات اور سماجی تنظیمیں بھی ان کے کام سے متاثر ہیں۔ علاوہ ازیں بڑے محنتی، تعلیم یافتہ اور باہمت شخصیت کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انکی تقرری تمام احباب کے لیے مبارک کرے۔ آمین

محی الدین عباسی چیف ایڈیٹر لاہور انٹرنیشنل لندن

1960-1968 آٹھ سال ایک کتھولک مسیحی جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلس چیف جسٹس آف پاکستان رہے لیکن اسلام کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیا درویش انسان تھا کوئی جائیداد نہیں تھی کرایہ کے کمرے میں انتقال کر گئے فیملی کے اصرار کے باوجود پاکستان چھوڑنے سے انکار کر دیا اور لاہور کے مسیحی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ دنیا بھر کے جیورسٹ ان کے مقالات کو (دی اسلامک کتھولک) کہہ کر پکارتے تھے اسلام کے شریعت لا پر ان کی تحریریں دنیا کہ بہترین یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں جو پاکستان کے لیے ایک اعزاز ہے۔

نائب وزیر اعظم سردار ولبھ پٹیل کا گاندھی کے قتل سے کیا تعلق تھا؟

تحریر: رجنیش کمار

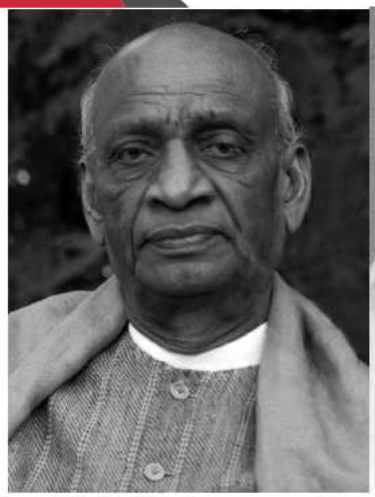

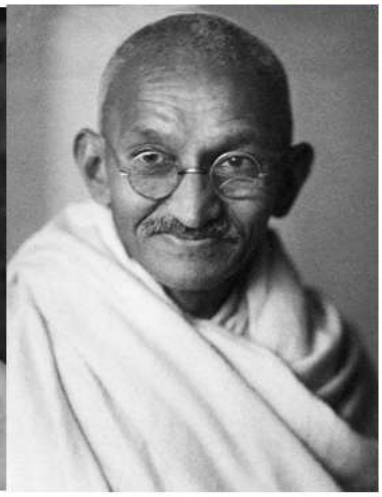

دس فروری سنہ 1949 کو دہلی کے لال قلعے کے آس پاس عوام کی نقل وحرکت بند کر دی گئی تھی۔ لال قلعے کے اطراف سکیورٹی فورسز کی بھاری نفری تعینات تھی۔ مہاتما گاندھی کے قتل سے متعلق عدالت کا فیصلہ آنے والا تھا۔ اس مقدمے کی سماعت کرنے والی خصوصی عدالت لال قلعے کے اندر ہی قائم کی گئی تھی۔ تقریباً 20 کے لگ بھگ ناتھورام گوڈسے (مرکزی ملزم) کے ساتھ دیگر آٹھ ملزمان کو کمرہ عدالت میں لایا گیا۔ ملزمان میں سے صرف ایک یعنی ساورکر کے چہرے پر سنجیدگی تھی جبکہ نتھورام گوڈسے، نارائن آپٹے اور وشنو کرکرے مسکراتے ہوئے کمرہ عدالت میں داخل ہوئے۔ سیاہ سوٹ زیب تن کیے جج آتما چرن گیارہ بج کر تیس منٹ پر کمرہ عدالت میں پہنچے۔ جج نے بیٹھتے ہی ناتھورام گوڈسے کا نام پکارا جس پر گوڈسے اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ پھر باری باری سب ملزمان کا نام پکارا گیا۔ جج آتما چرن نے گاندھی کے قتل میں ناتھورام گوڈسے اور نارائن آپٹے کو سزائے موت سنائی۔ وشنو کرکرے، مدن لال پہوا، شنکر کسٹیا، گوپال گوڈسے اور دتاتریہ پارچور کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ جج نے ساورکر کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے ان کی فوری رہائی کا حکم دیا۔ فیصلہ سننے کے بعد مرکزی ملزم گوڈسے سمیت ہر ایک نے کٹہرے سے باہر آ کر 'ہندو دھرم کی جے'، 'توڑ کر رہیں گے پاکستان' اور 'ہندی ہندو ہندوستان' کے نعرے لگائے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب گوڈسے نے کمرہ عدالت میں نعرے لگائے ہوں۔ اس سے قبل لال قلعہ میں سماعت کے دوران آٹھ نومبر 1948 کو سماعت کی تکمیل کے بعد عدالت نے ناتھورام گوڈسے سے پوچھا کہ کیا وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ گوڈسے نے کہا کہ وہ 93 صفحات پر مشتمل اپنا بیان پڑھنا چاہتے ہیں۔ گوڈسے نے صبح 10 بج کر 15 منٹ سے بیان پڑھنا شروع کیا۔ بیان پڑھنے سے پہلے انھوں نے بتایا کہ تحریری بیان چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ گوڈسے نے کہا کہ پہلے حصے میں سازش اور اس سے وابستہ چیزیں، دوسرے حصے میں گاندھی کی ابتدائی سیاست، تیسرا حصہ گاندھی کی سیاست کا آخری مرحلہ، چوتھا حصہ گاندھی جی اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد، پانچواں حصہ آزادی کے خواب کا ٹوٹ جانا اور آخری حصہ 'ملک دشمن اپیزمنٹ' کی پالیسی ہے۔

گوڈسے نے میڈیا سے اپیل کی کہ ان کے بیان کو بغیر کسی سیاق وسباق کے شائع نہ کیا جائے۔ 45 منٹ تک پڑھنے کے بعد گوڈسے غش کھا کر کمرے میں گر پڑے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے دوبارہ تحریری بیان پڑھنا شروع کیا، انھیں پورا بیان پڑھنے میں پانچ گھنٹے لگے۔ اس دوران وہ بار بار پانی پیتے رہے۔ گوڈسے نے اپنے بیان کا خاتمہ 'اکھنڈ بھارت امر رہے' اور 'وندے ماترم' کے نعروں سے کیا۔ چیف پراسیکیوٹر نے گوڈسے کے بیان کو عدالت کے ریکارڈ سے ہٹانے کی درخواست کی اور کہا کہ یہ مکمل طور پر غیر اہم ہیں۔ اس پر گوڈسے نے عدالت میں کہا کہ انھیں ہندوستان کی موجودہ حکومت پر اعتماد نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت 'مسلم پرست' ہے۔ تاہم جج آتما چرن نے گوڈسے کے بیان کو ریکارڈ سے ہٹانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ عدالتوں میں تحریری بیانات قبول کر لیے گئے ہیں۔ اس دن بھی عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نو نومبر سنہ 1948 کو جج آتما چرن نے ناتھورام سے 28 سوالات پوچھے۔ ایک سوال کے جواب میں، گوڈسے نے کہا: 'ہاں، میں نے گاندھی جی کو گولی ماری تھی۔ گولی لگنے کے بعد ایک شخص نے پیچھے سے مجھے سر پر مارا اور خون نکلنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے وہی کیا جو میں نے منصوبہ بنایا تھا اور مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ اس نے میرے ہاتھ سے پستول چھین لی۔ پستول آٹومیٹک تھا اور خدشہ تھا کہ اتفاقی طور پر کہیں نہ چل جائے۔ اس شخص نے مجھ پر پستول تان لی اور کہنے لگا کہ میں تمہیں گولی مار دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے گولی مار دو۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔' مہاتما گاندھی کے پوتے اور گاندھی کے قتل پر ایک مستند کتاب (لیٹس کل گاندھی) لکھنے والے تو شار گاندھی کہتے ہیں: 'یہ گوڈسے کا کورٹ روم ڈرامہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باپو کو قتل کر کے ہیرو بن جائیں گے اور ہندو ان کے اس کام سے متفق ہو جائیں گے۔ جب اس نے ایسا ہوتا ہوا نہیں دیکھا تو اس نے عدالت کے کمرے میں ڈرامہ کرنے کی کوشش کی۔'

30 جنوری 1948

یہ ایک بہت ہی منحوس دن تھا۔ دہلی ریلوے سٹیشن پر ریستوراں سے ناشتہ کر کے ناتھو

رام گوڈسے، نارائن آپٹے اور وشنو کرکرے برلا مندر کے لیے روانہ ہو گئے۔ گوڈسے نے برلا مندر کے پیچھے جنگل میں تین یا چار راؤنڈ فائر کیے اور پستول کا تجربہ کیا۔ صبح 11:30 بجے گوڈسے پرانی دلی ریلوے سٹیشن کے لیے اور کرکرے مدراس ہوٹل کے لیے نکل گئے۔ کرکے دوپہر دو بجے پرانی دلی ریلوے سٹیشن پہنچے۔ گوڈسے اور آپٹے نے وہاں ملاقات کی۔ شام کے ساڑھے چار بجے یہ تینوں ریلوے سٹیشن سے تانگے سے برلا مندر کے لیے روانہ ہوئے۔ گوڈسے نے برلا مندر کے پیچھے نصب شیوا جی کے مجسمے کا درشن کیا۔ آپٹے اور کرکرے، وہاں سے تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر برلا بھون چلے گئے، برلا بھون البقرق روڈ پر واقع تھا جو آج 30 جنوری روڈ کے نام سے موسوم ہے۔ برلا بھون کو اب 'گاندھی سمیتی' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ گوڈسے نے پرارتھنا (دعائیہ تقریب) کے لیے جانے والے مہاتما گاندھی کو پانچ بج کر 17 منٹ پر گولی مار دی۔ گوڈسے کو گرفتار کرلیا گیا لیکن آپٹے اور کرکرے دہلی سے فرار ہو گئے۔

گاندھی کا قتل اچانک نہیں ہوا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں پولیس کی غفلت کی کہانی گاندھی کے قتل سے ہی شروع ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ گاندھی کو قتل کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ گاندھی کے قتل کے 17 سال بعد 22 مارچ سنہ 1965 کو اس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا گیا تھا۔ اس انکوائری کمیشن کی سربراہی سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس جیون لال کپور کے سپرد تھی۔ اسے کپور انکوائری کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 12 اکتوبر سنہ 1964 کو ناتھورام گوڈسے کے چھوٹے بھائی گوپال گوڈسے کے علاوہ وشنو کرکرے اور مدن لال پہوا کو عمر قید کی سزا سنانے کے بعد رہا کیا گیا تھا۔ جب گوپال گوڈسے اور وشنو کرکرے پونے پہنچے تو ان کے دوستوں نے کسی ہیرو کی طرح ان کے استقبال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے لیے ایک پروگرام ترتیب دینے کا منصوبہ بنایا گیا جس میں گاندھی کے قتل میں ان کے کردار کی تعریف اور اس کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ 12 نومبر سنہ 1964 کو ستیہ وینائک پوجا منعقد ہوئی۔ اس کے لیے لوگوں کو مراٹھی زبان میں مدعو کیا گیا۔ اس دعوت نامے میں تحریر تھا کہ یہ پوجا وطن پرستوں کی رہائی کی خوشی میں منعقد کی جا رہی ہے اور آپ سب آ کر انھیں مبارکباد پیش کریں۔ اس تقریب میں تقریباً 200 افراد شریک ہوئے۔ اس پروگرام میں ناتھورام گوڈسے کو محب وطن بھی کہا گیا۔ سب سے حیران کن لوک مانیہ بال گنگادھر تلک کے پوتے جی وی کیتکر کا بیان تھا۔ جی وی کیتکر دو روزناموں 'کیسری' اور 'ترون بھارت' کے ایڈیٹر تھے۔ کیتکر ہندو مہاسبھا کے مفکر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ کیتکر ہی اس تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ پوجا کے بعد گوپال گوڈسے اور کرکرے نے جیل کے اپنے تجربات شیئر کیے اور اس دوران کیتکر نے کہا کہ وہ پہلے سے ہی گاندھی کے قتل کا منصوبہ جانتے تھے اور انھیں خود ناتھورام گوڈسے نے اس بارے میں بتایا تھا۔ تلک کے نواسے جی وی کیتکر نے کہا: 'چند ہفتوں قبل ہی گوڈسے نے شیوا جی مندر میں منعقدہ ایک میٹنگ میں اپنے ارادے کا اظہار کیا تھا۔ گوڈسے نے کہا تھا کہ گاندھی کہتے ہیں کہ وہ 125 سال کی عمر تک زندہ رہیں گے لیکن 125 سال تک انھیں کون زندہ رہنے دے گا؟ اس وقت ہمارے ساتھ بلوکا کا کنیٹکر بھی تھے اور گوڈسے کی تقریر کا یہ حصہ سن کر پریشان ہو گئے تھے۔' 'ہم نے کنیٹکر کو یقین دلایا کہ وہ ناتھیا (ناتھورام) کو سمجھا دیں گے اور ایسا کرنے سے روک دیں گے۔ میں نے ناتھورام سے پوچھا کہ کیا وہ گاندھی کو مارنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں، کیوں کہ وہ نہیں چاہتے کہ گاندھی ملک میں مزید پریشانیوں کا سبب بنے۔ کیتکر کا بیان پریس میں آگ کی طرح پھیل گیا۔' روزنامہ 'انڈین ایکسپریس' نے جی وی کیتکر کے انٹرویو پر مبنی ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ میں ایک تصویر بھی تھی جس میں ناتھورام گوڈسے کی تصویر کو مالا چڑھاتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ جی وی کیتکر نے 14 نومبر سنہ 1964 کو انڈین ایکسپریس کو بتایا: 'تین ماہ قبل ناتھورام گوڈسے نے مجھے گاندھی کے قتل کا منصوبہ بتایا تھا۔ جب مدن لال پہوا نے 20 جنوری 1948 کو گاندھی کی پرارتھنا سبھا میں بم پھینکا تو بڑگے اس کے بعد میرے پاس پونے آئے اور اس کے بارے میں بتایا۔ میں جانتا تھا کہ گاندھی کا قتل ہونے والا ہے۔ مجھے گوپال گوڈسے نے کہا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔' اس کے بعد کیتکر کو گرفتار کرلیا گیا۔ گوپال گوڈسے کو بھی دوبارہ گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ہی گاندھی کے قتل کی تحقیقات کے لیے کپور کمیشن کی تشکیل ہوئی۔ کہا گیا کہ گاندھی کا قتل منصوبہ بندی اور سازش کے تحت کیا گیا۔ لہٰذا اس کی مکمل تحقیقات کی جانی چاہیے اور معلوم کرنا چاہیے کہ اس میں اور کون کون ملوث تھا۔

گاندھی کے قتل کی فوری وجوہات

13 جنوری 1948 کو دن کے تقریباً 12 بجے مہاتما گاندھی دو مطالبات کے ساتھ بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کو انڈیا 55 کروڑ روپے دے اور دوسرا یہ کہ دہلی میں مسلمانوں پر حملے بند کیے جائیں۔ گاندھی کی بھوک ہڑتال کے تیسرے دن 15 جنوری کو انڈین حکومت نے اعلان کیا کہ وہ فوری طور پر پاکستان کو 55 کروڑ روپے دے گی۔ اس اعلان سے انتہا پسند ہندو گاندھی سے سخت ناراض ہو گئے تھے، خاص طور پر ہندو مہاسبھا والے۔ مہاتما گاندھی نے پرارتھنا کے بعد کی تقریر میں کہا: 'مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بے دخل نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہندو مہاجرین کو کسی بھی طرح کے تشدد میں ملوث نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔' تاہم تشار گاندھی کا کہنا ہے کہ باپو کی بھوک ہڑتال کا بنیادی مقصد پاکستان کو 55 کروڑ روپے دلوانا نہیں تھا بلکہ فرقہ وارانہ تشدد کو روکنا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم

کرنا تھا۔ وہ کہتے ہیں: 'یقیناً باپو پاکستان کو 55 کروڑ روپے دینے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے لیکن ان کا مقصد فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنا تھا۔' کیا نہرو اور پٹیل 55 کروڑ روپے پاکستان کو نہیں دینا چاہتے تھے؟ اس کے جواب میں تشار گاندھی کا کہنا ہے کہ 'کابینہ نے فیصلہ کیا کہ جب تک دونوں ممالک کے مابین تقسیم کا معاملہ حل نہیں ہوتا انڈیا پاکستان کو 55 کروڑ روپے نہیں دے گا۔ تاہم اس تقسیم کے بعد دونوں ممالک میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت انڈیا 75 کروڑ روپے غیر مشروط پاکستان کو دے گا۔'

'پاکستان کو ان میں سے 20 کروڑ روپے مل چکے تھے اور وہ 55 کروڑ بقایا رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔ پاکستان نے یہ رقم مانگنا شروع کر دی اور انڈیا وعدہ خلافی نہیں کر سکتا تھا۔ باپو نے کہا کہ جو وعدہ کیا گیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ ہوتا ہے تو دو طرفہ معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی۔' حکومت نے گاندھی کی بھوک ہڑتال کے صرف دو دن بعد ہی پاکستان کو 55 کروڑ روپے دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کے ساتھ ہی گاندھی سخت گیر ہندوؤں کی نظر میں ولن بن گئے تھے۔ سردار پٹیل بھی گاندھی کے پاکستان کو 55 کروڑ روپے دینے کے مطالبے سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ کپور کمیشن کی تحقیقات میں سردار پٹیل کی بیٹی منی بین پٹیل گواہ نمبر 79 کے طور پر پیش ہوئیں۔

پٹیل پر سوال کیوں اٹھائے گئے؟

منی بین نے کپور کمیشن کو بتایا: 'مجھے یاد ہے کہ میرے والد مہاتما گاندھی سے پاکستان کو 55 کروڑ روپے دینے پر راضی نہیں تھے۔ میرے والد کا خیال تھا کہ اگر پاکستان کو یہ رقم دی جاتی ہے تو لوگ اس سے ناراض ہو جائیں گے اور پاکستان کے ساتھ ہماری سمجھ یہ ہے کہ یہ رقم تمام معاملات حل ہونے کے بعد ہی دیے جانے چاہیے۔'

منی بین پٹیل نے کہا: 'میرے والد نے کہا تھا کہ اگر پاکستان کو یہ رقم مل جاتی ہے تو انڈیا میں لوگ اس کی غلط تشریح کریں گے اور پاکستان اس رقم کو ہمارے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی صورتحال میں ہمارے شہریوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔ میرے والد نے مہاتما گاندھی سے یہ بھی کہا کہ لوگ اس بھوک ہڑتال کو صحیح نہیں مانیں گے اور حکومت پر پاکستان کو 55 کروڑ روپے فراہم کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کے ایک ہتھیار کے طور پر اسے دیکھیں گے۔' تشار گاندھی کہتے ہیں کہ نہرو اور پٹیل 55 کروڑ روپے دینے پر راضی نہیں تھے کیونکہ عوامی جذبات ان کے لیے اہمیت کی حامل تھی۔ تو شار نے کہا: 'باپو اس بات کی بنیاد پر فیصلہ کیا کرتے تھے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ انسانیت ان کے لیے سب سے اہم تھی۔ وہ وعدہ خلافی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ عوامی دباؤ میں وہ غلط فیصلے کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ باپو نے وہی کرنے کے لیے کہا جس کا انڈیا نے وعدہ کیا تھا۔ نہرو اور پٹیل انتخابی سیاست میں داخل ہوئے تھے لیکن باپو آزادی کے بعد بھی اپنے انھی اصولوں پر چل رہے تھے۔ باپو نہ تو عوامی جذبات سے ڈرتے تھے اور نہ ہی موت سے۔' جب مہاتما گاندھی بھوک ہڑتال پر تھے تو لوگ برلا بھون میں ان کے خلاف مظاہرہ بھی کر رہے تھے۔ لوگ ناراض تھے کہ وہ حکومت کو 55 کروڑ روپے دینے پر مجبور کیوں کر رہے ہیں اور وہ دہلی میں مسلمانوں کے گھر ہندو مہاجرین کو کیوں نہیں دینے دے رہے ہیں۔ دہلی میں فرقہ وارانہ تناؤ کے سبب مسلمان گھر چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے۔ انھیں پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے کے حصے میں رکھا گیا تھا۔ ہندو مہاجر مسلمان کے گھروں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے جبکہ گاندھی اس کے خلاف بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے تھے۔ ہندو مہاجر گاندھی کی بھوک ہڑتال کے خلاف نعرے لگا رہے تھے: 'گاندھی مرتا ہے تو مرنے دو۔' مہاتما گاندھی کے تاحیات سکریٹری رہنے والے پیارے لال نے اپنی کتاب 'مہاتما گاندھی دی لاسٹ فیز' میں لکھا ہے کہ 'اس بھوک ہڑتال نے دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین دشمنی کو کم کرنے میں بہت مدد کی۔' 18 جنوری 1948 کو ایک امن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مہاتما گاندھی کو یقین دلایا گیا تھا کہ مہرولی میں صوفی بزرگ قطب الدین بختیار کاکی کا عرس ہر سال کی طرح منایا جائے گا۔ مسلمان دہلی میں اپنے گھر جا سکیں گے۔ مساجد کو ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے سے چھڑایا جائے گا۔ مسلم علاقوں کو غیر قانونی قبضے سے آزاد کرایا جائے گا۔ خوف کے سبب اپنے گھروں سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کی واپسی پر ہندو اعتراض نہیں کریں گے۔ ان یقین دہانیوں کے بعد مہاتما گاندھی نے 18 جنوری کو دوپہر 45.12 بجے مولانا آزاد کے ہاتھ سے سنترے کا جوس پی کر بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

تو کیا پھر گوڈسے قاتل نہیں ہوتا؟

اس کے بعد ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارم کے تحت ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں انھوں نے انڈین حکومت کو پاکستان کو 55 کروڑ روپے دینے اور ہندو مہاجرین کو مسلمانوں کے گھروں میں رہنے کی اجازت نہ دینے پر شدید تنقید کی۔ اس میٹنگ میں مہاتما گاندھی کے خلاف قابل اعتراض الفاظ بھی استعمال کیے گئے تھے۔ انھیں ڈکٹیٹر کہا گیا اور ان کا موازنہ ہٹلر سے کیا گیا۔ 19 جنوری کو ہندو مہاسبھا کے سیکریٹری آشوتوش لاہری نے ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک پرچہ نکلا۔ پولیس رپورٹس سے پتہ چلتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھوک ہڑتال سے سکھ بھی ناراض تھے۔ سکھوں کو بھی لگا کہ گاندھی نے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ پولیس رپورٹ کے مطابق دوسری طرف مسلمانوں نے 19 اور 23 جنوری کو یہ کہتے ہوئے دو قراردادیں منظور کیں کہ گاندھی نے ان کی بے لوث خدمت کی ہے۔

گاندھی کے قتل کے پس منظر میں یہ واقعات فوری وجوہات تھے۔ 17 اور 19

جنوری کے درمیان وہ افراد جنھوں نے گاندھی کے قتل کی منصوبہ بندی کی تھی اور انھیں ہلاک کیا وہ ٹرین اور فلائٹ سے دہلی پہنچے تھے۔ وہ دہلی اور ہندو مہاسبھا بھون کے ہوٹلوں میں قیام پذیر تھے۔ 18 جنوری 1948 کو شام کے پانچ بجے کچھ سازشیوں نے برلا بھون میں مہاتما گاندھی کے اجلاس میں شرکت کی۔ وہ مجمعے اور جگہ کا معائنہ کرنے گئے تھے۔ 19 جنوری کو ہندو مہاسبھا بھون میں ان کی میٹنگ ہوئی تھی اور مہاتما گاندھی کے قتل کا ایک مکمل خاکہ تیار کیا گیا تھا۔ 19 جنوری کو کل سات سازشیوں میں سے تین ناتھورام ونایک گوڈسے، وشنو کرکرے اور نارائن آپٹے برلا ہاؤس گئے اور پرارتھنا کی جگہ کا معائنہ کیا۔ اسی دن شام چار بجے وہ ایک بار پھر دعائیہ مجلس کے گراؤنڈ میں گئے اور رات دس بجے مہاسبھا بھون میں پانچوں ہندوؤں نے ملاقات کی۔ 20 جنوری کو ناتھورام گوڈسے کی طبیعت خراب ہوگئی لیکن چار افراد پھر بریلا بھون گئے اور وہاں کی سرگرمیوں کو سمجھا۔ یہ چار ہندو مہاسبھا بھون دن کے ساڑھے دس بجے برلا بھون واپس آئے۔ اس کے بعد انھوں نے ہندو مہاسبھا بھون کے پیچھے جنگل میں اپنا ریوالور چیک کیا۔ ریوالور کی جانچ پڑتال کے بعد وہ سب حتمی منصوبہ طے کرنے کے لیے دہلی کے کناٹ پلیس میں مرینا ہوٹل میں ملے۔ وہ شام پانچ بجے برلا بھون پہنچے۔ مدن لال پہوا نے برلا بھون کی دیوار کے پیچھے سے ایک پرارتھنا سبھا (دعائیہ تقریب) میں بم پھینکا۔ مدن لال کو اسی وقت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کے پاس سے ایک دستی بم بھی برآمد ہوا ہے۔ تین دیگر وہیں موجود تھے اور وہ بھیڑ کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو گئے۔ گاندھی کے پوتے توشار گاندھی کا کہنا ہے کہ باپو کو قتل کرنے کی اصل سازش صرف 20 جنوری کی تھی لیکن وہ اس دن ناکام رہے اور دس دن بعد گاندھی کی زندگی کا آخری دن آ گیا۔ توشھار گاندھی نے بی بی سی کو بتایا: 'ان کا منصوبہ یہ تھا کہ دھماکے کے بعد بھگدڑ مچ جائے گی اور وہ گاندھی جی کو گولی مار دے گا۔ لیکن جب مدن لال پہوا نے دھماکے کیا تو باپو نے سب کو سمجھا کر بٹھا دیا اور بھگدڑ نہیں مچنے دی۔ ایسی صورتحال میں برگے کو گولی چلانے کا موقع نہیں ملا اور اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس دن گولی مارنے کی ذمہ داری برگے پر عائد تھی۔ اگر وہ 20 جنوری کو کامیاب ہوتا تو قاتل گوڈسے نہیں بلکہ برگے ہوتا۔' قتل کے دو اہم مجرم ناتھورام گوڈسے اور نارائن آپٹے اسی دن دہلی کے سینٹرل ریلوے سٹیشن سے الہ آباد اور کانپور کے راستے بمبئی فرار ہو گئے۔ وہ 23 جنوری کی شام بمبئی پہنچے۔ تیسرے ناتھورام گوڈسے کے بھائی گوپال گوڈسے اسی رات دہلی کے فرنٹیئر ہندو ہوٹل میں ٹھہرے اور 21 جنوری کی صبح فرنٹیئر میل سے بمبئی روانہ ہو گئے۔ چوتھے وشنو کرکرے 23 جنوری کی دوپہر تک دہلی میں رہے اور سہ پہر میں وہ بھی ٹرین اور بس تبدیل کرتے ہوئے 26 جنوری کی صبح کلیان پہنچ گئے۔ دیگمبر بڑگے اور شنکر کسٹیا 20 جنوری کو بمبئی ایکسپریس سے کلیان کے لیے روانہ ہوئے اور 22 جنوری کی صبح پہنچے۔ اسی دن وہ پونے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس طرح قتل کی سازش میں شامل افراد دہلی سے فرار ہو گئے اور کوئی نہیں ملا۔

پولیس کی تاریخی غفلت

اگلے ہی دن 20 جنوری کو اخبارات میں بم پھینکنے کی خبر شائع ہوئی۔ ٹائمز آف انڈیا، سٹیٹس مین، بمبئی کرانیکل میں خبر شہ سرخیوں میں شائع ہوئی۔ اس وقت ٹائمز آف انڈیا کو ایک پولیس انسپکٹر نے بتایا تھا کہ 'یہ بم طاقتور تھا اور بہت سے لوگوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔ ہینڈ گرنیڈ کا مطلب مہاتما گاندھی کو مارنا تھا۔' بمبئی کرانیکل نے اطلاع دی ہے کہ مدنلال پہوا نے بم پھینکنے کے جرم کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ مہاتما گاندھی کی امن مہم سے ناراض ہیں لہذا ان پر حملہ کر دیا۔ مدن لال پہوا سے پہلے برلا بھون میں ہی تفتیش کی گئی، جس کے بعد انھیں پارلیمنٹ سٹریٹ پولیس سٹیشن لے جایا گیا۔ پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں نے پہوا سے پوچھ گچھ کی اور انھوں نے بیانات دیے۔ پہوا کے بیان پر کافی تنازع بھی ہوا۔ پہوا نے کرکرے کا نام لیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اور ان کے باقی ساتھی دہلی میں کہاں ٹھہرے ہیں۔ مرینا ہوٹل اور ہندو مہاسبھا بھون پر چھاپے مارے گئے۔ اس دوران یہ انکشاف ہوا کہ گوڈسے اور آپٹے نام تبدیل کر کے ایس اور ایم دیش پانڈے کے نام سے قیام کر رہے تھے۔ اس چھاپے میں ہندو مہاسبھا کے کچھ دستاویزات بھی برآمد ہوئے۔ 21 جنوری کو پہوا کو 15 دن کے ریمانڈ پر لیا گیا۔ پارلیمنٹ سٹریٹ پولیس سٹیشن سے پہوا کو سول لائنز لایا گیا اور پوچھ گچھ 24 جنوری تک جاری رہی۔ اپنے بیان میں پہوا نے 'ہندو راشٹر' نامی اخبار کے مالک کا نام لیا لیکن اخبار کے ایڈیٹر کا نام نہیں لیا۔ اس کے مالک آپٹے تھے جبکہ مدیر ناتھورام گوڈسے تھے۔ 23 جنوری کو مرینا ہوٹل کے ملازم کالی رام نے دہلی پولیس کے حوالے کچھ کپڑے کیے لیکن پولیس ان کو تفتیش میں استعمال کرنے میں ناکام رہی۔ 25 جنوری کو پہوا کو پولیس بمبئی لے گئی اور تفتیش 29 جنوری تک جاری رہی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ 27 جنوری کو گوڈسے اور آپٹے بمبئی سے دہلی روانہ ہو گئے۔ دونوں ٹرین سے گوالیار آئے اور رات کے وقت ڈاکٹر دتاتریہ پرچورے کے گھر ٹھہرے۔ اگلے دن یہیں سے اٹلی کی تیار کردہ بلیک خودکار بیریٹا ماؤزر خریدی۔ 29 جنوری کی صبح دہلی پہنچے۔ دونوں دہلی کے سینٹرل ریلوے سٹیشن پر ریلوے کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ یہیں پر ان کی ملاقات کرکرے سے ہوئی۔ 30 جنوری کو انھوں نے برلا بھون کے پیچھے جنگل میں پستول کی شوٹنگ کی مشق کی اور شام پانچ بجے باپو کو گولی مار دی۔ ناتھورام کو وہاں سے گرفتار کر لیا گیا لیکن آپٹے اور کارکرے ایک بار پھر دہلی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

آپٹے اور کارکرے کو 14 فروری کو گرفتار کیا گیا۔

پٹیل کی بیٹی کی دلیل

جج آتما چرن نے فیصلے کے بعد کہا کہ پولیس نے 19 اور 20 جنوری سنہ 1948 کے درمیان سراسر غفلت برتی۔ مدن لال پہوا کی گرفتاری کے بعد دہلی پولیس کو گاندھی جی کے قتل کی سازش کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔ جج آتما چرن نے کہا: 'مدن لال پہوا نے سازش کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ روئیا کالج کے پروفیسر جی سی جین نے بمبئی پریزیڈنسی کے وزیر داخلہ مرار جی دیسائی کو اس سازش کے بارے میں بتایا اور انھوں نے بھی بمبئی پولیس کو ساری معلومات دی تھی۔ لیکن پولیس بری طرح ناکام ہوگئی۔ اگر پولیس مناسب طریقے سے کام کرتی تو گاندھی جی کو شاید قتل نہ کیا جاتا۔'

اس کے باوجود کسی پولیس اہلکار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ تو شار گاندھی نے لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی قتل کیس میں چیف انویسٹی گیشن آفیسر جمشید ڈوراب ناگروالا نے ریٹائرمنٹ کے بعد کہا: 'میں پوری طرح اتفاق کرتا ہوں کہ ساورکر کی مدد اور شمولیت کے بغیر گاندھی کے قتل کی سازش کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ (لٹس کل گاندھی، صفحہ نمبر 691) اس کے باوجود ساورکر کو بے گناہ قرار دیا گیا۔' سردار پٹیل ملک کے وزیر داخلہ تھے لہذا ان پر بھی بہت سارے سوالات اٹھے۔ مولانا آزاد نے لکھا: 'جے پرکاش نارائن نے کہا تھا کہ وزیر داخلہ کی حیثیت سے گاندھی کے قتل میں سردار پٹیل اپنی ذمہ داری سے نہیں بھاگ سکتے۔' سردار پٹیل کی صاحبزادی منی بین پٹیل نے بطور گواہ کپور کمیشن کو دیے گئے اپنے بیان میں کہا کہ ان کے والد کو مسلم مخالف کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور ان کی جان کو خطرہ تھا کیونکہ انھیں جان سے مارنے کی دھمکی ان کے گھر تک آئی تھی۔ منی بین پٹیل نے یہ بھی اعتراف کیا کہ جے پرکاش نارائن نے عوامی طور پر ان کے والد کو گاندھی کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ منی بین نے کہا: جس میٹنگ میں ان کے والد کو جے پرکاش نارائن نے ذمہ دار ٹھہرایا تھا اس میں مولانا آزاد بھی شریک تھے لیکن انھیں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس سے میرے والد کو بہت تکلیف ہوئی۔'

منی بین پٹیل نے کپور کمیشن کو بتایا: 'میرے والد پاکستان کو 55 کروڑ روپے دینے سے بہت غمزدہ تھے۔ انھیں لگا کہ یہ پیسے دینے کی وجہ سے ہی باپو کا قتل ہوا۔ یہاں تک کہ نہرو بھی رقم دینے کے حق میں نہیں تھے۔ اس دوران سردار پٹیل نے نہرو سے کہا تھا کہ کابینہ سے چھٹی دے دیں کیوں کہ مولانا مجھے بھی نہیں چاہتے ہیں۔' گاندھی کے قتل کے بعد نہرو نے پٹیل کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کے بارے میں منی بین نے کہا کہ نہرو نے اس میں لکھا کہ 'ہمیں ماضی کو بھلا کر مل کر کام کرنا چاہیے۔' سردار نے نہرو کی بات مان لی لیکن جے پرکاش نارائن نے سردار پر حملہ کرنا جاری رکھا۔ پانچ مارچ سنہ 1948 کو سردار کو دل کا دورہ پڑا تو انھوں نے کہا کہ انھیں اب مرنا چاہیے اور گاندھی جی کے پاس جانا چاہیے۔ وہ تنہا چلے گئے ہیں۔ گاندھی کے قتل کے ایک ہفتہ بعد یعنی چھ فروری 1948 کو پارلیمنٹ کا خصوصی اجلاس طلب کیا گیا اور ارکان پارلیمنٹ نے سردار پٹیل سے بہت ترش سوالات پوچھے۔ 'تیج' اخبار کے بانی رکن پارلیمنٹ دیش بندھو گپتا نے پارلیمنٹ میں سردار پٹیل سے پوچھا: 'مدن لال پہوا نے گرفتاری کے بعد اپنے جرم کا اعتراف بھی کرلیا تھا اور آگے کے منصوبے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ کون کون اس میں شامل ہیں۔ ایسے میں کیا دہلی کی سی آئی ڈی بمبئی سے ان کی تصاویر حاصل نہیں کرسکتی تھی؟ فوٹو حاصل کرنے کے بعد اسے پرارتھنا سبھا میں تقسیم کردیا جاتا تاکہ لوگ چوکس رہتے۔ کیا اس میں سراسر غفلت نہیں ہوئی ہے؟'

اس سوال کے جواب میں پٹیل نے کہا کہ 'دلی پولیس نے انھیں پکڑنے کی کوشش کی لیکن سب مختلف جگہوں پر مقیم تھے۔ ان کی تصاویر بھی نہیں مل پائی تھی۔ تحقیقات میں مہاتما گاندھی کے سکریٹری پیارے لال گواہ نمبر 54 تھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ تقسیم کے بعد پٹیل کے گاندھی سے اختلافات تھے، لیکن گاندھی کے لیے ان کا احترام کم نہیں ہوا تھا۔ پیارے لال نے کہا کہ 'پٹیل کہتے تھے کہ مسلمان ہندوستان میں رہ سکتے ہیں اور انھیں سلامتی بھی ملے گی لیکن ان کی وفاداری کو انڈیا اور پاکستان کے درمیان منقسم نہیں رہ سکتی۔' منی بین پٹیل نے کہا ہے کہ ان کے والد سردار پٹیل باپو کی حفاظت کے بارے میں فکرمند تھے کیونکہ پہلے بھی حملے ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا: 'میرے والد مہاتما گاندھی کے پاس گئے تھے اور کہا تھا کہ پرارتھنا سبھا میں آنے والے لوگوں کی تفتیش ہوگی اور اس کے بعد انھیں اندر آنے کی اجازت دی جائے گی لیکن گاندھی جی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔'

گاندھی کا قتل اور آر ایس ایس

آر ایس ایس نے گاندھی کے قتل میں کسی بھی کردار کی مستقل تردید کی ہے، یہاں تک کہ راہل گاندھی کے خلاف بھی ہتک عزت کا ایک مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ گاندھی کے قتل کے بعد پٹیل نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ پر پابندی عائد کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'گاندھی کے قتل کے لیے وہ فرقہ وارانہ زہر ذمہ دار ہے جسے پورے ملک میں پھیلایا گیا ہے۔' گاندھی کے پرسنل سکریٹری نے احمد آباد سے شائع ہونے والے پرچے نوجیون پرکاشن میں لکھا: 'آر ایس ایس کے ممبروں کو کچھ جگہوں پر پہلے ہی سے ہدایت تھی کہ وہ جمعہ کے دن خوشخبری کے لیے ریڈیو کو کھلا رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی آر ایس ایس ممبروں نے بھی متعدد مقامات پر مٹھائیاں تقسیم کیں۔'

گاندھی کے قتل کے دو عشروں بعد آر ایس ایس کی ترجمان اشاعت 'آرگنائزر' نے 11 جنوری سنہ 1970 کو ایک اداریے میں لکھا تھا کہ 'نہرو کے پاکستان نواز ہونے اور گاندھی جی کے بھوک ہڑتال پر جانے سے لوگوں میں کافی ناراضگی تھی۔ ایسی

صورتحال میں ناتھورام گوڈسے لوگوں کی نمائندگی کر رہے تھے، گاندھی کا قتل عوامی غم و غصے کا اظہار تھا۔' کپور کمیشن کی رپورٹ میں سوشلسٹ رہنماؤں جے پرکاش نارائن، رام منوہر لوہیا اور کملا دیوی چٹوپادھیائے کی پریس کانفرنس میں اس بیان کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ 'گاندھی کے قتل کا ذمہ دار کوئی ایک شخص نہیں ہے لیکن اس کے پیچھے ایک بڑی سازش اور تنظیم ہے۔' اس تنظیم میں انھوں نے آر ایس ایس، ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کا نام لیا تھا۔ گاندھی کے قتل کے بعد آر ایس ایس پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ آر ایس ایس پر یہ پابندی فروری 1948 سے جولائی 1949 تک تھی۔ ناتھورام گوڈسے کے بھائی گوپال گوڈسے نے 28 جنوری 1994 کو فرنٹ لائن کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا: 'ہم سب بھائی آر ایس ایس میں تھے۔ ناتھورام، دتاتریہ، میں اور گووند۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے گھر میں نہیں آر ایس ایس میں بڑے ہوئے ہیں۔ آر ایس ایس ہمارے لیے خاندان تھا۔ ناتھورام آر ایس ایس میں دانشور کارکن بن گئے۔ ناتھوم نے اپنے بیان میں آر ایس ایس چھوڑنے کی بات کہی تھی۔ انہوں نے یہ بیان اس لیے دیا کہ گولوالکر اور آر ایس ایس گاندھی کے قتل میں نہ پھنس جائیں، لیکن ناتھوم نے آر ایس ایس کو نہیں چھوڑا تھا۔' اسی انٹرویو میں گوپال گوڈسے سے پوچھا گیا تھا کہ بی جے پی رہنما ایل کے اڈوانی نے آر ایس ایس کے ساتھ ناتھورام کے تعلقات کو مسترد کر دیا تھا تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا: 'وہ بزدلانہ باتیں کر رہے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آر ایس ایس نے ایسی کوئی قرارداد منظور نہیں کی تھی کہ 'جاؤ اور گاندھی کو مار دو' لیکن آپ آر ایس ایس کے ساتھ ناتھورام کے تعلقات کو مسترد نہیں کر سکتے۔ ناتھورام رام نے دانشور کارکن کے تحت سنہ 1944 میں ہندو مہاسبھا کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا۔' ناتھورام گوڈسے کبھی آر ایس ایس کے رکن رہ چکے تھے لیکن بعد میں وہ ہندو مہاسبھا میں آئے۔ تاہم گوڈسے کے کنبہ کے افراد نے 8 ستمبر سنہ 2016 کو ایکانومک ٹائمز کو ایک انٹرویو میں جو کہا وہ بہت اہم ہے۔ ناتھورم گوڈسے اور ونیاک دامودر ساورکر کی نسل کے فرد ستیا کی گوڈسے نے اکنامک ٹائمز کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا: 'ناتھورام 1932 میں جب سانگلی میں تھے تو انھوں نے آر ایس ایس میں شمولیت اختیار کی۔ جب تک وہ زندہ رہے وہ سنگھ کا فکری کارکن رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اس تنظیم کو نہیں چھوڑا اور نہ ہی انھیں برطرف کیا گیا۔' مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ وہ 125 سال تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ قتل سے تقریباً چھ سال قبل 72 سال کی عمر میں باپو نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان کی زندگی کو اچانک 37 سالہ مراٹھی برہمن ناتھورم گوڈسے نے ختم کر دیا۔ جب گاندھی کا قتل ہوا تو وہ 78 سال کے تھے۔ (بشکریہ بی بی سی)

❁❁❁

نورِ ایماں کی حدت سے، شمعِ محبت جلا کر تو دیکھو

ریاض احمد ملک دوالمیال ضلع چکوال

نمازوں میں لطف دعاؤں کا اٹھا کر تو دیکھو
ابتلاؤں میں سر سجدوں میں جھکا کر تو دیکھو
کشتیٔ دل آزمائیشوں کے چنگل سے نکل جائے گی
دلوں میں خدا پر کامل یقیں بسا کر تو دیکھو
ممتا کی دعائیں نارِ ظلم کو کر دیں گی ٹھنڈا
دامن پہ ممتا کے آنسوں کو گرا کر تو دیکھو
ناؤ خود ہی بھنور سے باہر نکل جائے گی
بحرِ محمدِ مصطفیٰؐ میں غوطہ لگا کر تو دیکھو
خود بخود درِ خیبر کھل جائے گا اللہ کے کرم سے
دلوں میں حبِ علی اور جرأتِ شبیر بسا کر تو دیکھو
یقینِ کامل ہو تو خدا بھر دیتا ہے رہائی کی گدا سے
درِ مولا پہ خالی کشکول اپنا بڑھا کر تو دیکھو
طوفانوں کے رخ پل میں بدل جائیں گے
اپنے آقا کی دعاؤں کو کبھی بلا کر تو دیکھو
بجلیوں کی کڑک تمہاری حفاظت پہ لگ جائے گی
پڑھتے درود و سلام آشیانے اپنے بنا کر تو دیکھو
خزاؤں کے شب خون سے مت گھبرا، بلبلِ بے نوا
فضائیں بہاروں کی فضلِ مولا سے بلا کر تو دیکھو
انہیں مردہ شاخوں سے رمق زندگی کی پھوٹے گی
مسیحِ محمدیؐ کی دعاؤں کے اثر آزما کر تو دیکھو
ریاضؔ اس کا نور روشن کر دے گا سارے سماں کو
نورِ ایماں کی حدت سے شمعِ محبت جلا کر تو دیکھو

❁❁❁

آسٹریلیا: قومی ترانے میں ایک لفظ کی تبدیلی اور ہزاروں برس کا قرض

تحریر: ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

سال 2021 کے آغاز سے معاً قبل وزیر اعظم جناب سکاٹ موریسن نے آسٹریلیا کے موجودہ قومی ترانے میں ایک لفظ کی تبدیلی کا اعلان کیا۔

آپ نے بتایا کہ ترانے میں شامل ایک لائن

For we are young and Free

یعنی (ہم نوخیز اور آزاد ہیں) کی بجائے:

For we are one and free

(ہم ایک اور آزاد ہیں) لکھا اور پڑھا جائے گا۔

یہ تبدیلی یکم جنوری 2021 سے نافذ العمل ہو چکی ہے۔

آپ نے بتایا کہ ایک لفظ کی تبدیلی سے اس کی شعریت اور ترنم پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن تاریخی اور معنوی لحاظ سے بہت بڑا فرق رونما ہو جائے گا۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ آسٹریلیا کی تاریخ کو برطانوی نوآبادیاتی دور کے آغاز سے نہیں بلکہ 40 تا 60 ہزار سال سے آباد قدیم (ایبوریجنی) اقوام کی تاریخ کے ساتھ مدغم کر کے اپنایا جا رہا ہے۔ آسٹریلیا کوئی نوخیز یا نوزائدہ (Young) ملک نہیں۔ یہ یہاں کی پہلی اقوام (First Nations) کا بھی ملک ہے اور ہم ان کے ساتھ مل کر ایک اور آزاد ملک ہیں۔ آپ نے کہا کہ ماڈرن ملک کی حیثیت سے تو ہم نوخیز ہی ہیں لیکن اس خطے میں آباد اقوام کی کہانی بہت قدیم ہے۔ اس تبدیلی کا اصل سہرا ریاست نیو ساؤتھ ویلز کی خاتون پریمئر کو جاتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے اپنی سرکاری حیثیت میں کھل کر اس کی تجویز وفاقی حکومت کے سامنے رکھی۔ واضح رہے کہ آسٹریلیا کا موجودہ قومی ترانہ 1984 میں اپنایا گیا تھا جو پیٹر میک کورمک نامی شاعر نے "ایڈوانس آسٹریلیا فیئر" کے نام سے 1878 میں ایک طویل نظم کی صورت میں لکھا تھا۔ اس نظم کے آخری حصہ میں آسٹریلیا کے "برطانوی ماضی" کا فخر سے ذکر کیا گیا تھا اس لئے اس حصے کو قومی ترانے میں شامل نہیں کیا گیا۔ ماضی میں اس نظم میں وقتاً فوقتاً اور بھی کچھ تبدیلیاں کی جا چکی ہیں۔ یہ نظم سابقہ قومی ترانے کے علاوہ ایک مقبول عام قومی نغمہ کے طور پر اہم موقعوں پر گائی جاتی تھی۔ 1984 سے قبل آسٹریلیا میں (گاڈ سیو دی کوئین) (God Save The Queen) کا ترانہ رائج تھا جو کہ برطانیہ کا قومی ترانہ ہے۔ مذکورہ تبدیلی کا جہاں بہت سے حلقوں کی طرف سے خیر مقدم کیا گیا ہے وہیں اس پر عدم اطمینان اور رنج و غم کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ قوم پرست ناقدین کا کہنا ہے کہ کیا ایک عدد لفظ کی تبدیلی سے آسٹریلیا کی ہزاروں سال پرانی تاریخ اور صدیوں سے یہاں کے قدیم سیاہ فام باسیوں پر روا رکھے جانے والے ظالمانہ اور نسلی امتیاز پر مبنی سلوک کا قرض چکایا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ جب برطانوی سامراج نے آسٹریلیا کو اپنی نوآبادیاتی مملکت بنانے کا اعلان کیا تو اس زمین پر ہزاروں سال سے آباد چلے آ رہے قدیم ایبوریجنی باشندوں کو اس براعظم کا مالک یا وارث تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ ان قدیم نسل کے انسانوں کے پاس ایسے کوئی "دستاویزی" ثبوت یا شواہد موجود نہ تھے جس سے یہ سرزمین آسٹریلیا پر اپنی جدی پشتی ملکیت ثابت کر سکتے۔ افریقہ اور ہندوستان کے برعکس نہ یہاں کوئی مکان، نہ کوئی زرعی فارم، حتیٰ کہ جھاڑ جھنکاڑ یا پتھروں سے بنائی کوئی چار دیواری یا لکیر تک موجود نہ تھی۔ لباس پہننے یا لکھنے پڑھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ آجا کر کچھ قدرتی غاروں کی چھت یا دیواروں پر آڑھی ترچھی لائنوں سے بنی کچھ تصاویر (جن کے "معانی" اب جا کر معلوم ہوئے ہیں) دور دراز کے علاقوں میں موجود تھیں لیکن اس سے کسی کی ملکیت کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ پھل فروٹ، جانوروں کے شکار اور پانی کی تلاش میں مستقلاً نقل مکانی بھی کرتے رہتے تھے۔

شمالی علاقہ جات جو ملحقہ جزائر اور انڈونیشیا سے قریب ہیں، وہاں "غیر ملکیوں" کی چھوڑی ہوئی اشیاء یا کاشتکاری اور جھونپڑیوں، گنڈولوں، حتیٰ کہ اسلحہ تک وغیرہ کے آثار تو موجود تھے لیکن وہ مقامی باشندوں کے سادہ سے دماغوں کی اختراع ہرگز نہ تھے۔ یہ لوگ تو کسی اور ہی بابا آدم کی نسل میں سے تھے اور ابھی تک تیس چالیس ہزار سال پرانا تمدن جاری رکھے ہوئے تھے اس لئے ان بیچاروں کو بڑی آسانی سے اس پورے براعظم کی ملکیت سے جبراً دست بردار کر دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں، ان بیچاروں کو گورے آبادکاروں نے جانوروں کی طرح شکار کر کے مارنا بھی شروع کر دیا حتیٰ کہ مبینہ طور پر آسٹریلیا کے جنوب میں واقع تسمانیہ کے جزیرے میں ایک ایبوریجنی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ ان "شکار" کئے ہوئے دیسی باشندوں کی کھوپڑیاں اور حنوط شدہ سر یوروپ کے عجائب گھروں میں بطور تحفہ یا بغرض تحقیق بھجوائے گئے۔ جو گزشتہ برس 2020 سے اب باقاعدہ معافی نامہ کے ساتھ واپس بھجوائے جا رہے ہیں اور یہاں ان کی مقامی رسومات کے ساتھ تدفین شروع ہے۔ اسی طرح کوشش کی جاتی کہ یہاں کی مقامی عورتوں کو پکڑ کر جنسی غلام کے طور پر رکھا جائے۔ ان سے پیدا ہونے والے بچوں کو ان

کی ماؤں سے جبراً الگ کر دیا جاتا تھا اور انہیں گوروں کی بنائی ہوئی نرسریوں، ہاسٹلوں میں رکھا جاتا تھا۔ان ہزارہا بچوں کو "چوری شدہ نسلیں" (Stolen Generations) کہا جاتا ہے۔اسی طرح سے گورے آبادکار جو کیپٹن کک کے ہمراہ یا پھر بعد میں آنا شروع ہوئے وہ اپنے ساتھ طرح طرح کی بیماریاں، مثلاً چیچک، ٹی بی، خسرہ، خناق، چکن پاکس، ہیضہ، ٹائیفائڈ وغیرہ اور پھر جنسی بیماریاں آتشک، سوزاک وغیرہ ہمراہ لائے اور دنیا کے اس الگ تھلگ اور قدرتی طور پر محفوظ علاقے میں آباد ان مقامی باشندوں کی سینکڑوں بلکہ ایک اندازہ کے مطابق 70 فیصد آبادی تک کی اموات کا الگ سے باعث بنے۔ایک ایسا دردناک واقعہ بھی ہے جب مبینہ طور پر کچھ معصوم ایبورجنی (جانور) کنگرو افراد کو ہانک کر اور ان سے ہی چتا بنوا کر بڑھکتی آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔یہ وہ نام نہاد جدید تہذیب تھی جو سفید سامراج کے نام نہاد نمائندے اپنے ہمراہ آسٹریلیا لائے تھے۔اسی لئے کیپٹن کک کی آمد اور اس دن کو جب اس نے سڈنی کی باٹنی بے Botany Bay پر برطانوی جھنڈا لہرایا تھا، یوم سیاہ اور یوم قبضہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔کیپٹن کک کے بارہ میں یہ بھی معلوم رہے کہ اس کے بارہ میں جو کہا جاتا ہے کہ آسٹریلیا کو کیپٹن کک نے "دریافت" کیا تھا، بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے کئی برس پیشتر دیگر یورپی سیاحوں نے آسٹریلیا کو نہ صرف دریافت کیا تھا بلکہ اس کا باقاعدہ سروے بھی تیار کیا تھا لیکن انہوں نے اس بیابان جگہ کو "ناقابل رہائش" قرار دے کر اسے ڈچ، سپینش یا پرتگالی کالونی بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔یہی نہیں بلکہ یورپی اقوام سے بھی بہت پہلے انڈونیشیا کے ساحلوں سے ہوتے ہوتے یہاں مسلمان اور عرب ملاح اور تاجر شمالی آسٹریلیا سے بخوبی واقف تھے اور یہاں ان کے باقاعدہ شواہد موجود ہیں۔ہاں کیپٹن کک نے اگر کوئی کام کیا تو وہ یہ کہ وہ پہلا سفید فام باشندہ تھا جس نے پہلی بار اس سرزمین کو برطانوی نوآبادیاتی سامراج کے زیر تسلط کالونی بنانے کا اعلان کیا۔سابق وزیراعظم جناب مالکم ٹرن بُل صاحب بھی کیپٹن کک کی آمد والے دن کے بارہ میں کھلم کھلا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ دن بجا طور پر "یوم قبضہ" (Invasion Day) کہلائے جانے کے لائق ہے۔جیسا کہ ایبورجنی باشندے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں کہتی ہیں۔قارئین کرام اس خونچکاں داستان کو مختصر کرتے ہوئے بتاتا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور دنیا بھر سے شرم دلانے اور پھٹکار پڑنے نیز انسانی حقوق کی تنظیموں خصوصاً عیسائی مشنریوں کی مسلسل کاوشوں سے 1967 میں پہلی بار ان مقامی باشندوں کو "انسان" قرار دیا گیا اور پہلی بار مردم شماری میں آبادکار گوروں کے ساتھ انہیں بھی مردم شماری میں گنا گیا۔اس سے قبل یہ لوگ نباتات اور جانوروں کی طرح گردانا جاتے تھے۔شام سے پہلے تمام آبادیوں میں بگل بجائے جاتے اور ان باشندوں کا شہروں سے نکل کر "واپس" جنگل بیابان میں جانا لازمی ہوتا تھا۔بیسویں صدی کے وسط تک ان باشندوں کو، خواہ وہ پڑھے لکھے اور سرکاری ملازمت میں بھی کیوں نہ ہوں، بیرون ملک سفر کے لئے آسٹریلین پاسپورٹ بھی نہیں ملتا تھا بلکہ خصوصی سفری دستاویز جاری کی جاتی تھیں۔اندازہ کریں کہ جدید دور میں آکر سن 2012 میں آکر تجویز پیش کی گئی کہ نسلی امتیاز بنا پر کسی سے امتیازی سلوک روا رکھنا اب باقاعدہ جرم گردانا جائے گا!۔اس سے قبل 2007 میں لیبر دور حکومت کے وزیر اعظم جناب کیون رڈ صاحب Kevin Rudd نے بطور وزیراعظم نیشنل اسمبلی میں سفید فام استعمار کی طرف سے آسٹریلیا کے ان اصل باشندوں پر صدیوں سے ڈھائے گئے مظالم پر سرکاری طور پر "سوری" (Sorry) تو کہا لیکن معافی مانگنے سے پھر بھی انکار کر دیا کیونکہ اس مطلب اس ملک کے جملہ حقوق ان کے نام محفوظ کرنا ہونگے جس کی بہت ہی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔ان باشندوں کی متعدد قوم پرست تنظیموں کا یہ مطالبہ بدستور چلا آرہا ہے کہ آسٹریلیا کے آئین میں انہیں اس سرزمین کا اصل مالک تسلیم کیا جائے لیکن ہنوز وہ اس میں ناکام رہی ہیں۔ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ تقاریر اور تقریبات کے آغاز میں رسمی طور پر انہیں اس زمین کے روایتی محافظ یعنی کسٹوڈین (Traditional Custodian) تسلیم کیا جاتا ہے لیکن آسٹریلین آئین میں ان کا اس قسم کا کوئی حق یا ذکر (Recognition) موجود نہیں۔ایبورجنی نمائندوں کا کہنا ہے کہ اگر آئین میں انہیں آسٹریلیا کی فرسٹ جنریشن یعنی اول نسل تسلیم کر لیا جائے تو یہ ان کا ایسا "برتھ سرٹیفکیٹ" ہوگا، جس سے وہ محروم چلے آرہے ہیں۔حکومتی حلقوں کا اصرار ہے کہ جب آئین اور قانون کے مطابق اب ہم سب ایک ہیں تو پھر کسی مخصوص گروہ یا نسل کو آئین میں امتیازی حیثیت دینے کا جواز باقی نہیں رہتا۔ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا 2021 میں آسٹریلیا کے قومی ترانے میں ایک لفظ کی تبدیلی ان اقوام کو ان کا مطلوبہ آئینی حق دئے جانے کا متبادل ثابت ہو پائے گی؟، ان کے تین سو سال سے زائد چلے آرہے دکھوں کا مداوا کر پائے گی؟ اور اس سرزمین سے وابستہ ہزاروں سال پرانی ان کی تاریخ کا قرض چکا پائے گی، جسے برطانوی استعمار نے 1788 میں تسلیم کرنے سے کلیتاً انکار کر دیا تھا؟۔

دم تحریر ان کی اکثریت اب بھی ناگفتہ بہ حالت میں زندگی بسر کر رہی ہے، ان کی اوسط عمر سفید فام آسٹریلین سے اب بھی اوسطاً دس برس کم ہوتی ہے، اور بے روزگاری، منشیات، جرائم، شوگر، بلڈ پریشر، امراض گردہ، ڈپریشن جیسے عارضے اور خودکشی (جن کی شرح سب سے نوجوان نسل، جن میں 8 اور دس دس سال کے بچے بھی شامل ہیں) کی شرح بھیانک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔انسانی حقوق اور نسلی مساوات کی مکمل بحالی کے لئے آسٹریلیا کو رینگ رینگ کر نہیں بلکہ سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے کہ پلوں کے نیچے پہلے ہی بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ

تحریر: لیاقت علی

فروری 1849 میں گجرات کے نزدیک چیلیانوالہ میں دوسری اینگلو سکھ جنگ میں لاہور دربار کی افواج کو شکست دے کر مارچ 1849 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ 40 سال قبل مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور فتح کر کے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی وہ اس کے جانشینوں کی نااہلی، درباری سازشوں، سکھ سرداروں کے لالچ، باہمی آویزشوں اور معاشی و اقتصادی بدحالی کا بوجھ نہ سنبھالنے کی بدولت زمین بوس ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ کے پرکھوں کا تعلق گجرانوالہ کے نواحی علاقوں سے تھا۔ اس کے خاندان میں بدھ سنگھ وہ پہلا شخص تھا جس نے نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔

بدھ سنگھ کے بارے کہا جاتا تھا کہ سکھ مذہب کے دسویں گورو گوبند سنگھ نے اسے پہول دے کر سکھ مذہب میں داخل کیا تھا۔ بدھ سنگھ اور اس کی گھوڑی دیساں کو گجرانوالہ اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں الف لیلوی شہرت حاصل تھی۔ بدھ سنگھ آخری عہد مغلیہ کے پنجاب کے ان وار لارڈز میں سے تھا جنھوں نے ابتدائی طور پر راہزنی کی بنیاد پر طاقت وقوت حاصل کی تھی اور پنجاب بھر میں چھوٹی چھوٹی خود مختار 'حکومتیں' قائم کرلی تھیں۔ بدھ سنگھ 1718 میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں زخمی ہوکر مرگیا۔ بدھ سنگھ کے بیٹے نودھ سنگھ نے سکرچک کے گاوں کو اپنا مرکز بنایا اور ایک گروہ منظم کیا جو بعدازاں اس کے گاوں کے نام کی مناسبت سے سکرچکیہ مشہور ہوا تھا۔ سکرچکیہ گروہ سے وابستہ افراد نے دیگر سکھ گروہوں جنھیں ان دنوں مثل کا نام دیا جاتا تھا احمد شاہ ابدالی کے خلاف متعدد لڑائیوں میں حصہ لیا اور جہلم اور راوی دریاوں کے درمیانی علاقوں پر قبضہ جمالیا۔ نودھ سنگھ بھی 1752 میں ہوئی ایک لڑائی میں مارا گیا۔ نودھ سنگھ کی موت کے بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے چڑھت سنگھ نے اپنے باپ کے قبضے کئے علاقوں کا انتظام وانصرام سنبھالا۔ چڑھت سنگھ نے اپنا مرکز سکرچک گاوں سے گجرانوالہ منتقل کرلیا۔ چڑھت سنگھ نے گجرانوالہ شہر کے اردگرد فصیل بنوائی اور شہر کی حفاظت کے لئے اس کے چاروں اطراف میں مورچے بنوائے تھے۔ چڑھت سنگھ اپنی ہی بندوق پھٹنے سے ہلاک ہوگیا اور اس کا 42 سالہ بیٹا مہاں سنگھ اس کا جانشین قرار پایا۔ مہاں سنگھ نے گجرانوالہ شہر کے اندر اپنا قلعہ تعمیر کرایا جس کا نام اس نے گڑھی مہاں سنگھ رکھا تھا۔ مہاں سنگھ نے رسول پور، علی پور، پنڈی بھٹیاں، ساہی وال، عیسی خیل اور سیال کوٹ پر قبضہ کرلیا۔ یہ مہاں سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا باپ تھا۔

رنجیت سنگھ 13 نومبر 1780 کو گجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ ایک تحقیق کے مطابق وہ سندھ کے قریب واقع ایک قصبے بدرکھان میں پیدا ہوا تھا کیونکہ اس کی ماں راج کور کا تعلق اسی قصبے سے تھا۔ بچپن میں رنجیت سنگھ چیچک کا شکار ہوگیا جس کی وجہ سے اس کی بائیں آنکھ ضایع ہوگئی تھی اور اس کے چہرے پر بدنما داغ ابھر آئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے بچپن کے بارے کچھ زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں لیکن ایک بات مصدقہ ہے کہ وہ بالکل ان پڑھ تھا۔ رنجیت سنگھ کے سوانح نگاروں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ہندو اور سکھ لکھاریوں نے اسے ایک نیک، پاکباز اور ایثار وقربانی سے بھرپور پنجابی قوم پرست کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان لکھاریوں کی علمی اور تحقیقی بددیانتی نے رنجیت سنگھ جیسے ولولہ انگیز انسان اور پختہ کار سیاستدان کو ایک بے روح سادھو اور سادہ فہم وفراست کا حامل قوم پرست بنادیا ہے۔ مسلم مورخین کا رویہ رنجیت سنگھ کے بارے میں تعصّبات سے بھرپور اور یک طرفہ ہے۔ وہ اسے بے وقوف، مجہول اور عیاش انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آج بھی رنجیت سنگھ کی بے وقوفی بارے لطائف زبان زدعام ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے انگریز مورخین کا تعلق تو انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اخلاق سے عاری، شاطر اور وعدوں سے مکرجانے والے ہندوستانی حکمران کے طور پر یاد کیا ہے۔ انگریز مصنفین نے مہاراجہ کے بارے سنی سنائی باتوں کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنا کر انھیں مستند بنانے کی کوشش کی ہے۔ رنجیت سنگھ نہ تو ایک بے غرض پنجابی قوم پرست تھا جیسا کہ پنجابی قوم پرست اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی عیاش اور لالچی اور خودغرض جیسا کہ اس کے مخالفین اسے پینٹ کرتے ہیں۔ وہ نہ تو نیکی کا مجسمہ تھا اور نہ ہی محض شہوت پرست شیطان۔ وہ تو ایک ایسا ولولہ انگیز اور زندگی سے بھرپور کردار تھا کہ اس کی داستان حیات کو بے جان حقائق

اور خشک اور ادق اعداد و شمار کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ رنجیت سنگھ ہر اعتبار سے اتنا ہی غیر معمولی حکمران اور انسان تھا جتنا اس کا ہم عصر فرانس کا نپولین۔ وہ ایک عام سے سکھ سردار سے ترقی اور عروج حاصل کر کے انیسویں صدی کے ہندوستان کا ایک طاقتور حکمران بنا ایک ایسا حکمران جس نے انگریزوں سے برابری کی سطح پر مذاکرات اور معاہدے کیے تھے۔

یہ کریڈٹ رنجیت سنگھ کو ہی جاتا ہے کہ اس نے اپنی سلطنت قائم سینکڑوں جاگیرداروں اور وار لارڈز کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنایا اور اور بہت بڑی خون ریزی کے بغیر اتنی بڑی سلطنت قائم کی جس کی سرحدیں شمال میں چین اور افغانستان جب کہ جنوب میں سندھ کے صحراؤں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ رنجیت سنگھ نے اپنی رعایا میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی تھی اور اس کی فوج میں شامل ہندو اور سکھ فوجیوں نے اپنے ہم مذہب ہندو اور سکھ فوجیوں کو شکست دی تھی اور مسلمان فوجیوں نے 'کافروں' کا ساتھ نہ دینے کے مطالبے کو حقارت سے مسترد کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ کی شخصی زندگی اس کے سیاسی اور فوجی کیریئر کی طرح ہی رنگین تھی۔ اگرچہ وہ کوئی خوبصورت انسان نہیں تھا تاہم وہ اپنے اردگرد خوبصورت عورتوں اور مردوں کو دیکھنا بے حد پسند کرتا تھا۔ اس کی قد و قامت معمولی تھی لیکن وہ انتہائی بہادر اور دلیر تھا۔ وہ شراب نوشی میں احتیاط برتنے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ تاہم ناؤنوش کی محفلیں ختم ہونے کے بعد وہ صبح تک اپنے عملے کو خطوط اور اور دیگر دفتری امور ڈکٹیٹ قرایہ کرتا تھا۔ وہ سیاسی چالیں بہت سمجھ بوجھ کر چلتا تھا لیکن یہ بھی مشہور تھا کہ وہ صرف ایک گھوڑے کے حصول کے لئے قتل و غارت بھی کر سکتا تھا۔ رنجیت سنگھ کی قائم کردہ سلطنت انہدام کے بارے بھی بہت سطحی اور غیر متعلق وجوہات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ تمام فیوڈل ایمپایرز کسانوں کے استحصال اور فتوحات سے حاصل ہونے والی لوٹ مار پر چلتی رہی ہیں۔ رنجیت سنگھ کی زندگی ہی میں فتوحات کا سلسلہ رک چکا تھا۔ جاگیرداروں کی طرف سے نافذ کردہ بھاری ٹیکسوں کی بدولت کسان غربت اور ناداری کے ہاتھوں نڈھال ہو چکے تھے۔ ان کے پاس لاہور دربار کو دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ ریونیو کے دونوں ذرائع بند ہونے اور یورپ میں برطانیہ، فرانس اور بعد ازاں وسطی ایشیا کی پیش قدمی کی بدولت ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ تر سکھ سلطنت کی آزادی و خودمختاری کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے جانشینوں کی نالائقی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں اور بہتر فوجی، سفارتی اور سیاسی حکمت عملی کی بدولت رنجیت سنگھ کی سلطنت چار دہائیوں کے بعد زمین بوس ہو گئی۔

رنجیت سنگھ از خشونت سنگھ اردو ترجمہ: احسن بٹ

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے"، لاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

خلائی جہاز کی تباہی جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا

تحریر: راجینی ودیاناتھن

خلائی جہاز چیلنجر اپنی لانچ کے منٹ کے بعد تباہ ہو گیا تھا اور اس پر سوار ساتوں خلا باز ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ ایک سانحہ بھی تھا اور ایک انتہائی حیران کن واقعے جس نے دنیا کو ہلاک کر رکھ دیا تھا۔ اس سارے واقعے میں کل وقت 73 سیکنڈ لگے تھے۔ دنیا بھر میں لاکھوں لوگوں نے 28 جنوری 1986 میں امریکی خلائی ایجنسی ناسا کی سپیس شٹل کی لانچ کی نشریات دیکھیں۔ اور جیسے ہی اس پر کامنٹری خاموش ہو گئی اور آسمان پر دھویں کی ایک لکیر ہی رہ گئی، ساری دنیا کو پتا چل گیا کہ چیلنجر کے مشن میں کچھ انتہائی بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ یہ پرواز شدید سردی کے باعث کئی روز تک ملتوی کی گئی تھی۔ بعد میں تحقیقات سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ایک راکٹ بوسٹر کا سیل خراب ڈیزائن اور شدید سردی کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا جب امریکی خلا باز دورانِ پرواز مارے گئے تھے اور یہ ملک کے لیے ایک بڑا نقصان تھا۔

قومی صدمہ

امریکہ کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ خلا بازوں کے ساتھ سپیس شٹلز مدار میں بھیج سکتا تھا اور 1981 سے 1986 تک اس نے 20 مرتبہ کامیابی کے ساتھ کیپ کنیورل سے سپیس ٹرانسپورٹ سسٹم کو لانچ کیا تھا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں سے چیلنجر کا آخری سفر شروع ہوا۔ دنیا بھر میں لوگوں نے براہِ راست دیکھا کہ کیا تباہ کن واقعہ پیش آیا ہے۔ اس وقت 16 سولہ برائن بالارڈ موقعے پر لوگوں کے لیے بنائے گئے خصوصی ڈیک پر موجود تھے۔ وہ یاد کرتے ہیں کہ 'پہلے میں نے سوچا کہ اس نے صحیح وقت پر اپنے حصے علیحدہ کیے ہیں۔ پھر مجھے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر کوئی کنفیوژ ہو گیا تھا۔ میں پھر بھی امید لگائے بیٹھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی بھی کوئی دوسرا پلان ہو گا۔' وہ کہتے ہیں کہ 'مجھے اس بات کا احساس ہونے میں تھوڑا وقت لگا کہ اب وہ واپس نہیں آ رہے۔' برائن بالارڈ اس وقت اپنے سکول کے اخبار 'دی کرمسن' کے لیے شٹل کے لانچ کی خبر کور کرنے کے لیے گئے تھے۔ انھیں اس لیے بھیجا گیا تھا کیونکہ ان کے سکول کی ایک ٹیچر کرسٹا مکنولف چیلنجر پر سوار تھیں اور انھیں امید تھی کہ وہ خلا میں جانے والی پہلی ٹیچر بن جائیں گی۔ کرسٹا مکنولف نیو ہیمشائر کے کونکورڈ ہائی سکول میں پڑھاتی تھیں۔ انھیں ناسا کے 'ٹیچر ان سپیس' پروگرام کے تحت منتخب کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کو صدر ریگن نے 1986 میں متعارف کروایا تھا۔ اس کا مقصد خلا بازی اور سائنس کی تعلیم میں لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ تھا۔ 1986 میں ریاست کنیٹیکٹ کے ایک ہائی سکول میں پڑھانے والے ڈین بارسٹو اس پروگرام کے بارے بتاتے ہیں کہ 'ہم اپنے طلبہ کو خلا بازی اور سائنس کی تعلیمات دینے کے بارے میں بہت خوش تھے۔ ہم یہ سوچتے تھے کہ جانے کون سا ٹیچر اگلی بار جائے گا۔'

خلا کی تعلیم

یہی وجہ تھی کہ بہت سے سکولوں نے چیلنجر کے لانچ کو براہِ راست دکھانے میں دلچسپی ظاہر کی۔ اس کی نشریات سینکڑوں سکولوں میں براہِ راست نشر کی جا رہی تھیں۔ ڈین بارسٹو کہتے ہیں کہ 'ہمارا پورا سکول آڈیٹوریم میں جمع ہو کر دیکھ رہا تھا۔' مگر ان کے بہت سے طلبہ چیلنجر کے پھٹنے کے بعد خاموشی میں آڈیٹوریم سے چلے گئے۔ دنیا بھر میں شٹل کے لانچ سائنس میں امید کی علامت تھے تو یہ ناکامی قومی سطح پر ایک نقصان تھا اور اس سے سپیس پروگرام کو بھی ٹھیس پہنچی۔ مگر یہ امریکی سپیس پروگرام میں پہلا سانحہ نہیں تھا۔ 1967 میں جب اپولو 1 کے کمانڈ موڈیول میں آگ لگی تو اندر موجود تینوں خلا باز ہلاک ہو گئے تھے۔ مگر چیلنجر کے حادثے کی خاص بات یہ تھی کہ اسے براہِ راست دنیا بھر میں نشر کیا گیا تھا اور لوگوں نے اسے براہ راست تباہ ہوتے ہوئے دیکھا۔

اہم موقعہ

سمتھسونین نیشنل سپیس اینڈ ایئر میوزیم سے وابستہ ویلری نیل کہتی ہیں کہ 'لوگوں کو ایسا لگا تھا کہ جیسے کہ وہ خود وہاں پر موجود تھے۔' وہ کہتی ہیں کہ 'امریکیوں کو چاند پر انسان کے پہنچنے اور اپولو 13 کی واپسی کے بعد کامیابی کی عادت سی ہو چکی تھی اور ان کے خیال میں ہی نہیں تھا کہ ہمارے سپیس پروگرام میں ناکامی ہو سکتی ہے۔'' اس کے علاوہ ناکامی کے احساس کو بڑھاوا یہ بات دے رہی تھی کہ ایک عام امریکی شہری جسے اپنا خواب پورا کرنے کے لیے چنا گیا تھا وہ اپنا خواب پورا نہیں کر سکی۔' اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ کہیں سپیس پروگرام کا ورثہ مکمل طور پر تباہ نہ ہو جائے، ہلاک ہونے والوں کے لواحقین نے چیلنجر سنٹر فار سپیس سائنس ایجوکیشن بنایا جس کا مقصد خلائی سفر کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ مگر جن بچوں نے چیلنجر کا حادثہ آنکھوں سے دیکھا تھا ان کی زندگی میں یہ ایک اہم موقعہ تھا۔ مارک ایڈلمین اس وقت سات سال عمر کے تھے۔ وہ کہتے ہیں 'مجھے کلاس روم میں داخل ہونا یاد ہے اور مجھے یاد ہے کہ ہر کوئی چلا رہا تھا کہ شٹل پھٹ گئی ہے۔' اور ان کے سکول کے لیے یہ اور زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ ان کے سکول کی ایک ٹیچر نے بھی اسی پروگرام کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ مارک کہتے ہیں کہ 'بہت سے بچوں کے لیے یہ پہلا موقع تھا جب ان کی زندگی پر کسی اہم واقعے کا اثر پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ میری ٹیچر بھی ہو سکتی تھیں۔' مارک کے خیال میں اس واقعے نے امریکیوں کو متحد کر دیا تھا۔ وہ اسے 9/11 کی طرح کا حادثہ تصور کرتے ہیں۔ اس قومی صدمے کے نتیجے میں صدر ریگن نے اسی شام اپنا سٹیٹ آف یونین خطاب بھی ملتوی کر دیا اور انھوں نے خصوصی طور پر ان بچوں کا بھی ذکر کیا جو اس سے متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے بعد میں اپنے حطاب میں کہا کہ 'ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لوگ کس قدر تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ یہ سب دریافت اور تحقیق کے عمل کا حصہ ہے۔ یہ خطرات کا سامنا کرتے ہوئے انسانیت کی ترقی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مستقبل ڈرپوک لوگوں کا نہیں، مستقبل بہادر لوگوں کا ہے۔'

☆ یہ مضمون پہلی مرتبہ بی بی سی ورلڈ کی ویب سائٹ پر 28 جنوری 2011 کو شائع کیا گیا تھا۔

’آگ کی جھیل‘ جسے مقامی لوگ ’جہنم کا دروازہ‘ قرار دیتے ہیں

تحریر: بیلا فالک

نیرا گونگو وسطی افریقہ میں چھپی یہ سلگتی ہوئی ایک جھیل جسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ منظر فلم ’لارڈ آف دی رنگز‘ سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ جھیل کرہِ ارض کے وسط تک جانے کا راستہ ہے جہاں مائع چٹانوں کا درجہ حرارت 1000 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے ’شیطان کی ہانڈی میں سوپ اُبل رہا ہوں۔‘ ماہر آتش فشاں بینوئٹ سیمٹز کے مطابق عوامی جمہوریہ کانگو میں چھپے اس آتش فشاں ’نیرا گونگو‘ میں دہکتی ہوئی آگ کا یہ گڑھا دنیا کے سب سے بڑے اور زندہ آتش فشاؤں میں سے ایک ہے۔ ماہر آتش فشاں سمیٹس نینوئٹ نے تقریباً پانچ برس تک اس آتش فشاں پر تحقیق کی ہے۔ 260 میٹر چوڑے اس آگ کے تالاب کو آتش فشاں کے دھانے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں تقریباً 60 لاکھ کیوبک میٹر لاوا موجود ہے جو کہ 2500 اولمپک سوئمنگ پولز کو بھرنے کے لیے کافی ہے۔

آگ اور گندھک (سلفر)

نیرا گونگو نامی یہ آتش فشاں سنہ 2002 سے مستقل پھوٹ رہا ہے اور اسی لیے اسے دنیا کے سب سے متحرک آتش فشاؤں میں شامل کیا گیا ہے۔ جب لاوا پھٹتا ہے تو آتش فشاں کی گہرائی میں اس کے مرکز سے گیس بھی خارج ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ ٹھنڈا ہو کر دوبارہ اس کے اندر ڈوب جاتا ہے۔ لاوے کے گرم اور پھر سرد ہونے کے اس مسلسل عمل کی وجہ سے اس میں کسی آبشار جیسی آواز پیدا ہوتی ہے جس کے دوران گیس کے دھماکے بھی سنائی دیتے ہیں جو سلگتے ہوئے لاوے کے شعلوں کو دس میٹر تک فضا میں بلند کرتے ہیں۔ بینوئٹ سیمٹز کہتے ہیں کہ ’کرہ ارض پر ایسی کوئی دوسری جگہ نہیں، آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہو کر آپ کو احساس ہوتا ہے کہ زمین ایک زندہ چیز ہے اور ہم انسان اس سیارے کی انتہائی چھوٹی سی مخلوق ہیں۔‘

ایک حیرت انگیز چمک

کبھی کبھار آتش فشاں کا یہ تالاب جب بھاپ، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور کاربن ڈائی آکسائیڈ سے ڈھک جاتا ہے تو لاوے کی یہ جھیل دکھائی نہیں دیتی، لیکن کبھی کبھار یہ اتنا صاف ہوتا ہے کہ جھیل کا یہ ’دہکتا حُسن‘ صاف نظر آتا ہے اور سات سو میٹر گہری اس جھیل کے مناظر یہاں آنے والوں کے چہروں پر ایک گرم چمک بن کر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ نظارہ رات کے وقت زیادہ روح پرور ہوتا ہے جب ان پگھلی ہوئی چٹانوں کی سرخ اور سیاہ نوکیں اندھیرے میں چمکتی ہیں اور دہکتے ہوئے تالاب سے نکلنے والی تپش آسمان پر نارنجی روشنی بن کر پھیل جاتی ہے۔

دوست یا دشمن

نیرا گونگو ڈی آر کانگو کے مشرق میں روانڈا کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ یہ آتش فشاں شہر کے انتہائی قریب ہے۔ یہاں سے شہر صرف 18 کلومیٹر دور ہے۔ یہاں کی واحد خاتون گائیڈ روتھ امرونگی کا کہنا ہے کہ ’اس شہر کے لوگ خوفزدہ بھی ہیں اور اسے نظر انداز بھی کرتے ہیں۔‘ ’ہم ایک ایسی چیز کے قرب میں رہتے ہیں جو ایک خوفناک تباہی کا باعث بن سکتی ہے، لیکن ہم اپنی زندگیاں خوف میں نہیں گزار سکتے۔‘ ’اگر ہم نتائج کی پرواہ کرتے رہیں گے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس آتش فشاں کی مثبت بات یہ ہے کہ یہاں سیاح آتے ہیں۔ محققین اور میڈیا بھی آتا ہے جس کی وجہ سے یہاں ملازمتیں ملتی ہیں اور مقامی کاروبار کی مدد ہو جاتی ہے۔‘ ’اس کے علاوہ اس علاقے کے تحفظ کے بارے میں بھی آگاہی پیدا ہوتی ہے۔‘

جہنم کا دروازہ

مقامی لوگوں میں نیرا گونگو سے متعلق کئی پُراسرار کہانیاں مشہور ہیں۔

کئی لوگ یقین رکھتے ہیں کہ یہ ’جہنم کی روحوں کا ٹھکانہ ہے۔‘ جبکہ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک دوسری دنیا کی طرف جانے کا راستہ ہے جہاں پر ’گناہ گاروں کی روحوں کو جلایا جاتا ہے۔‘ دوسری جانب نیک لوگوں کی روحیں قریب ہی روانڈا میں موجود ایک دوسری پہاڑی ’کاریسمبی‘ میں جاتی ہیں جو کہ ایک غیر متحرک آتش فشاں ہے جو برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نیرا گونگو میں لاوا اس وقت پھوٹتا ہے جب بُری روحیں ناراض ہو جاتی ہیں۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو مقامی افراد آتش فشاں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے عبادات کرتے ہیں۔ ایسی افواہیں بھی ہیں کہ گذشتہ صدیوں میں ان عبادات کے دوران کنواری لڑکیوں کو بھی اس آتش فشاں کے اندر پھینکا جاتا تھا۔

جنت کا باغ

نیرا گونگو کانگو کی روانڈا اور یوگنڈا کی سرحد کے ساتھ موجود ویرونگا نیشنل پارک میں

واقع ہے۔ یہ افریقہ میں قدیم اور حیاتیاتی طور پر متنوع ترین علاقہ ہے جو انداز اً دنیا بھر کے جنگلی گوریلوں میں سے ایک تہائی کا مسکن ہے۔ یہاں آٹھ آتش فشاں ہیں جن میں سے دو اب بھی متحرک ہیں۔ یہ تقریباً تیس لاکھ سال قبل کرہ ارض کی ٹیکٹانکس طاقت کے باعث وجود میں آئے۔

قدرت کی طاقتیں

کسی بھی وقت کرہ ارض پر پانچ سے آٹھ لاوا کی جھلیں ہوتی ہیں۔ اتنی کم تعداد کی ایک وجہ اس کی تشکیل کے لیے ضروری حالات کا غیر معمولی ہونا ہے۔ ماہر آتش فشاں کینیتھ سیمٹز کا کہنا ہے کہ 'اس کے لیے سطح سے بہت قریب لاوے کا دہانا ہونا ضروری ہے جو آتش فشاں کے ایسے نظام سے منسلک ہو جو لاوے کو اوپر کی جانب لا سکے۔' سیمٹز اس لاوے کی جھیل کے مطالعے کے سلسلے میں درجنوں مرتبہ نیرا گونگو پر کوہ پیمائی کر چکے ہیں۔

ان کا کہنا ہے 'لاوا کی کثافت کا بھی درست ہونا ضروری ہے، اس لاوے میں سیلیکا کی مقدار 50 فیصد سے کم ہے جو اسے زیادہ بہنے کے قابل بناتا ہے (سیلیکا کی وجہ سے لاوا زیادہ چپچپا ہو جاتا ہے)۔' یہ حالات وقت کے ساتھ ساتھ برقرار رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے لاوے کی جھیلیں خاص طور پر نیرا گونگو جیسے ہونا بہت نایاب ہے۔'

حیرت کدہ

سائنسدانوں کے لیے نیرا گونگو کے آتش فشاں کا مطالعہ ایک انتہائی دلفریب تجربہ ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔ سمز کہتے ہیں 'لاوے کی یہ جھیل نہ صرف بڑی اور غیر معمولی ہے بلکہ یہ ناقابل یقین حد تک متحرک بھی ہے اور یہ ہر سال بدلتی رہتی ہیں۔' جب میں سنہ 2010 یہاں آیا تھا تو لاوے کی جھیل ساکن تھی اور لاوا اس گڑھے کے فرش سے صرف پندرہ میٹر کی بلندی پر ٹھہرا ہوا تھا۔ 'مجھے لاوے کو دیکھنے کے لیے لاوے کے چھینٹوں سے بنی عمودی کونوں پر چڑھنا پڑا، جو اتنی گرم تھیں کہ میرے جوتوں کے تلوے نرم ہو گئے اور مجھے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے تھرمل دستانے پہننے پڑے۔' جب اس کے اندر سے نکلنے والی گیس سطح کو چیرتی ہوئی نکلتی تو ایسے لگتا کہ کسی برتن میں پانی اُبل رہا ہے۔ لاوے کے چھینٹے میرے سر سے اونچے جاتے ہوئے واپس میرے سامنے جھیل میں گرتے رہے۔ یہ سب بہت بڑا تھا، شدید سرخ رنگت اور خطرناک حد تک گرمی کے ساتھ یہ انتہائی سحر انگیز تھا۔

ایک مشکل کوہ پیمائی

نیرا گونگو کی چٹان 3470 میٹر بلند ہے اور لاوے کی جھیل تک پہنچنے کے لیے سیاحوں کو کانگو کی سرحد کے پار روانڈا جانا پڑتا ہے اور پھر وہاں سے پہاڑی کی چوٹی تک کوہ پیمائی کرنی پڑتی ہے۔ یہ فاصلہ آٹھ کلومیٹر کا ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر عمودی چڑھائی ہے۔ چوٹی تک پہنچنے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں اور ہائیکرز رات وہاں گزار کر صبح واپس نیچے آتے ہیں۔ خطے میں جاری تنازع کی وجہ سے سیاحوں کو ایک گروہ کی صورت میں جانا پڑتا ہے جن کے ساتھ مسلح رینجرز ہوتے ہیں۔ یہ کمزور دل افراد کا کام ہرگز نہیں ہے۔ ورونگا پارک کے رینجرز پر اکثر مسلح ملیشیا کی جانب سے حملہ کیا جاتا ہے۔ صرف سنہ 2020 میں 14 رینجرز اور چار شہری مارے گئے اور پھر اس پارک کو بند کر دیا گیا۔

دھماکے کی طاقت

نیرا گونگو گذشتہ پچاس برسوں میں دو بار پھٹا ہے۔ سنہ 1977 میں لاوے کی ایک بہت بڑی مقدار آدھی رات کو پھوٹ پڑی اور تقریباً 30 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے قریبی دیہاتوں میں پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے کم از کم ساٹھ افراد ہلاک ہوئے ہوئے تاہم بعض اندازوں کے مطابق ہلاکتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سنہ 2002 میں یہ آتش فشاں ایک بار پھر پھوٹ پڑا تھا۔ اس مرتبہ آتش فشاں کی ایک جانب سے یہ لاوا نکلا۔ سارا لاوا گوما شہر میں پھیل گیا تھا۔ 150 کے قریب لوگ ہلاک ہوئے اور شہر 15 فیصد کے قریب تباہ ہو گیا۔ اس سے ہزاروں افراد بے گھر ہو گئے تھے۔

تنبیہی اشارے

تب سے اب تک گوما شہر کی آبادی میں دس لاکھ سے زائد کا اضافہ ہو چکا ہے اور آج آتش فشاں کے پھٹنے کے خطرات کی ہر ممکن نگرانی کی جاتی ہے۔ سیمٹز کہتے ہیں سوال یہ نہیں ہے کہ اگلی بار آتش فشاں پھٹے گا یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ 'ایسا کب ہوگا؟'

'کرہ ارض پر موجود کسی بھی دوسرے آتش فشاں کی طرح ہمیں اگلی بار آتش فشاں پھٹنے سے متعلق پیشگی اشاروں پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ آئندہ آتش فشاں پھٹنے سے متعلق شاید ایسے اشارے ملیں لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بغیر کسی وارننگ کے ہو جائے، اس لیے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اگلی بار آتش فشاں کب پھٹے گا۔'

زندگی چلتی رہتی ہے

لیکن یہاں کے مقامی لوگ ثابت قدم ہیں۔ راجر کبالی ایک آتش فشاں کے گائیڈ ہیں اور وہ نیرا گونگو پر سو مرتبہ سے زیادہ مرتبہ جا چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں 'ہر مرتبہ جب میں لاوے کی جھیل کو دیکھتا ہوں تو میں حیران رہ جاتا ہوں، ایسا لگتا ہے جیسے میں کرہ ارض کے وسط میں دیکھ رہا ہوں۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ زمین زندہ ہے اور میرا خدا کی حیران کُن تخلیقات پر یقین بڑھ جاتا ہے۔' کبالی کے خیال میں اس جھیل کو دیکھنے کا بہترین وقت بارشوں کا موسم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت جھیل کو ڈھکنے والے بادل بارش کی وجہ سے صاف ہو جاتے ہیں۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ یہ موسم ہوادار اور سرد ہو سکتا ہے خصوصاً رات کے وقت لیکن جب آپ یہاں ابلتے ہوئے لاوے کو دیکھنے آتے ہیں تو آپ اس قدر سحر زدہ ہو جاتے ہیں کہ آپ سردی کو بھول جاتے ہیں۔

چین کے اویغور کیمپوں میں منظم انداز میں مبینہ ریپ کا انکشاف

تحریر: میتھو ہل، ڈیوڈ کمپنالے اور جوئل گنٹر

چین میں اویغور افراد کے لیے بنائے گئے 'تربیتی کیمپوں' میں خواتین کو ایک منظم انداز میں ریپ کیا جاتا ہے، انھیں جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے اور اُن پر تشدد کیا جاتا ہے۔ بی بی سی کو ان کیمپوں کے بارے میں نئی اطلاعات موصول ہوئی ہے۔ اس کہانی میں تورسنے زیائدین یاد کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ وہاں (کیمپ میں) مرد ہمیشہ ماسک پہنے ہوئے ہوتے تھے اس بات سے قطع نظر کہ اس وقت تک کورونا کی عالمی وبا نہیں پھیلی تھی۔ وہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے سوٹ پہنے ہوتے تھے، نا کہ روایتی پولیس یونیفارم۔ رات بارہ بجے کے بعد وہ آتے تھے اور اپنی مرضی کی خواتین چُن کر ایک راہداری میں لے جاتے تھے، جہاں کوئی کیمرا نصب نہیں تھا۔ زیائدین کہتی ہیں کہ متعدد مرتبہ رات کے وقت انھیں بھی اُس راہداری میں لے جایا گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ وہاں جو کچھ ہوا وہ بھلانا بہت مشکل ہے۔ 'میں چاہتی ہوں کہ یہ الفاظ میرے منھ سے ہی نہ نکلیں۔' تورسنے زیائدین نے چین کے صوبے سنکیانگ میں موجودہ حراستی مراکز کے خفیہ نظام میں نو ماہ گزارے ہیں۔ آزادانہ اندازوں کے مطابق ان کیمپوں میں تقریباً دس لاکھ سے زیادہ مرد اور خواتین کو رکھا گیا ہے۔ چین کا کہنا ہے کہ ان کیمپوں کا مقصد اویغور اور دیگر اقلیتوں کی 'تعلیمِ نو' ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ چینی حکومت نے وقتاً فوقتاً اویغوروں کی مذہبی آزادی ختم کی ہے جو کہ ایک بڑے پیمانے پر نگرانی کے نظام، حراستوں، زبردستی تعلیم، اور یہاں تک کہ لوگوں کو بانجھ کرنے کی مہم کی شکل میں سامنے آ رہی ہے۔ یہ پالیسی چین کے صدر شی ژن پنگ کی جانب سے سامنے آئی ہے۔ صدر نے سنہ 2014 میں علیحدگی پسندوں کے دہشتگردانہ حملے کے بعد سنکیانگ صوبے کا دورہ کیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد نیویارک ٹائمز کو لیک کی گئی کچھ دستاویزات کے مطابق صدر نے حکام سے کہا تھا کہ وہ 'بالکل کسی رحم' کے بغیر اس کا سدِ باب کریں۔

امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ چینی اقدامات نسل کشی کے مترادف ہیں۔ چین کا کہنا ہے کہ بڑے پیمانے پر حراستوں اور لوگوں کو بانجھ کرنے کی اطلاعات 'سراسر جھوٹ' ہیں۔

ان کیمپوں کے اندر کے حالات کی کہانیاں مشکل سے ہی ملتی ہیں تاہم متعدد ایسے افراد جنھیں وہاں بند رکھا گیا اور ایک گارڈ نے بی بی سی سے بات کی اور بتایا ہے کہ انھوں نے وہاں پر منظم انداز میں ہونے والے ریپ اور تشدد کے شواہد دیکھے ہیں۔

تورسنے زیائدین اپنی رہائی کے بعد امریکہ منتقل ہو گئیں تھیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ خواتین کو ان کے کمروں سے رات کو نکالا جاتا ہے اور ماسک پہنے مرد انھیں ریپ کرتے۔ وہ کہتی ہیں کہ انھیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور تین مرتبہ ان کا گینگ ریپ کیا گیا اور ہر مرتبہ دو سے تین مردوں نے انھیں ریپ کیا۔ تورسنے زیائدین نے پہلے بھی میڈیا سے بات کی ہے مگر اس وقت وہ قازقستان میں تھیں جہاں انھیں ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ انھیں چین واپس بھیج دیا جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں یہ خوف تھا کہ اگر انھوں نے جنسی تشدد کی اصل کہانی ظاہر کر دی اور انھیں چین واپس بھیج دیا گیا تو انھیں اس سے زیادہ سخت سزا دی جائے گی۔ وہ کہتی ہیں کہ اس کے علاوہ انھیں اس پر شرمندگی بھی تھی جو کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ تورسنے زیائدین کی کہانی کی آزادانہ تصدیق کرنا ممکن نہیں کیونکہ چین میں صحافیوں پر شدید پابندیاں ہیں۔ تاہم انھوں نے جو سفری دستاویزات اور امیگریشن ریکارڈ بی بی سی کو پیش کیا ہے وہ ان کے بیانات کی کسی حد تک تائید کرتا ہے۔ ان کی سنکیانگ کی کیونز کاؤنٹی میں کیمپ کے بارے میں معلومات، بی بی سی کی جانب سے دیکھی گئی سیٹلائٹ تصاویر کے مطابق معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کیمپوں کے اندر موجود حالات جو انھوں نے بیان کیے ہیں، ان کیمپوں سے رہا ہونے والے دیگر افراد بھی ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ سنہ 2017 اور سنہ 2018 کا کیونز کاؤنٹی کا عدالتی ریکارڈ بی بی سی کو ایڈرین زینز نے فراہم کیا ہے جو کہ چین کی سنکیانگ میں پالیسیوں کے حوالے سے ایک اہم ماہر مانے جاتے ہیں۔ اس ریکارڈ میں 'اہم گروہوں کی تعلیم کے ذریعے تبدیلی' کی تفصیلی منصوبہ بندی اور اخراجات کے شواہد ملتے ہیں۔ یہ الفاظ چین میں اویغور کی تعلیمِ نو کو بیان کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک دستاویز میں اس 'تعلیمی عمل' کو 'ذہن سازی' 'دلوں کی صفائی'، 'حق کی مضبوطی'، اور 'باطل کا خاتمہ' قرار دیا گیا ہے۔ بی بی سی نے سنکیانگ سے ایک قازق خاتون کا انٹرویو بھی کیا جنھیں 18 ماہ تک اس کیمپ سسٹم میں رکھا گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ انھیں اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ اویغور خواتین کو برہنہ کریں اور انھیں ہتھکڑیاں لگائیں اور پھر انھیں چینی مردوں کے سامنے اکیلا چھوڑ دیں۔ وہ کہتی ہیں کہ بعد میں وہ کمرے کو صاف کیا کرتی تھیں۔

گلزیرہ ایولخان بتاتی ہیں کہ 'میرا کام تھا کہ خواتین کی قمیضیں اُتاروں اور پھر انھیں ہتھ

کڑیاں لگاؤں تاکہ وہ ہل نہ سکیں۔' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے سر کے پیچھے اپنی کلائیاں لے جا کر دیکھاتی ہیں کہ وہ کس پوزیشن میں خواتین کو ہتھ کڑیاں لگاتی تھیں۔' پھر میں کمرے سے باہر آ جاتی تھی اور کوئی چینی مرد کبھی باہر سے یا پھر کوئی پولیس والا کمرے میں داخل ہوتے تھے۔ میں کمرے کے باہر خاموشی سے بیٹھی ہوتی تھی اور جب وہ مرد کمرے سے نکلتا تھا تو میں اس خاتون کو نہانے کے لیے لے کر جاتی تھی۔' وہ کہتی ہیں کہ 'چینی مرد نوجوان قیدیوں اور خوبصورت قیدیوں کو حاصل کرنے کے لیے رقم بھی ادا کرتے تھے۔ ان کیمپوں کے کچھ اور سابق قیدیوں نے کہا ہے کہ انھیں گارڈز کی مدد کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا یا پھر انھیں سزا دی جاتی تھی۔ گلزیرہ ایولخان کہتی ہیں کہ مداخلت کرنے یا مزاحمت کرنے کی ان میں طاقت نہیں تھی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہاں پر ریپ کا ایک منظم نظام تھا، تو انھوں نے کہا' ہاں بالکل تھا۔ تورسنے زیائدین کا کہنا ہے کہ کچھ خواتین کو جب لے کر جایا جاتا تھا تو وہ لوٹتی نہیں تھیں۔ کچھ خواتین جو لوٹتی تھیں، انھیں کہا جاتا تھا کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ کسی کو نہیں بتائیں۔ وہ کہتی ہیں کہ' آپ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتے۔ آپ بس خاموشی سے آ کر لیٹ سکتے ہیں۔ اس کا مقصد آپ کے حوصلے کو تباہ کرنا ہے۔ ایڈرئن زینز نے بی بی سی کو بتایا کہ' جب سے یہ معاملہ شروع ہوا ہے، یہ اس کی خوفناک ترین کہانیاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں' یہ شواہد اس بدترین خدشے کی تائید کرتے ہیں جو شروع سے ہمارے ذہنوں میں ہیں۔ یہ جنسی تشدد کا تفصیلی منظر نامہ ہے اور یہ ہمارے پہلے خدشات سے بھی زیادہ بُرے حالات بیان کرتا ہے۔'

اویغور برادری زیادہ تر ایک مسلم ترک اقلیتی گروہ پر مشتمل ہے اور ایک اندازے کے مطابق سنکیانگ میں ایک کروڑ دس لاکھ اویغور رہتے ہیں۔ اس صوبے سے متصل قازقستان ہے اور یہاں نسلی قازق بھی رہتے ہیں۔ 42 سالہ تورسنے زیائدین خود اویغور ہیں جبکہ ان کے شوہر قازق ہیں۔ پانچ سال تک قازقستان رہنے کے بعد یہ دونوں سنکیانگ سنہ 2016 کے آخر میں لوٹے تھے۔ تورسنے کہتی ہیں کہ یہاں آمد پر ان سے تفتیش کی گئی اور ان کے پاسپورٹ ضبط کر لیے گئے۔ کچھ ماہ بعد پولیس نے ان سے کہا کہ وہ کچھ دیگر اویغور اور قازق افراد کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کریں۔ جب وہ وہاں گئیں تو ان سب کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب پہلی مرتبہ انھیں حراست میں رکھا گیا تو وہ قدرے بہتر وقت تھا جب انھیں ٹھیک سے کھانا ملتا تھا اور ان کی فون تک رسائی تھی۔ ایک ماہ بعد ان کے معدے میں السر ہو گیا اور انھیں رہا کر دیا گیا۔ ان کے شوہر کا پاسپورٹ لوٹا دیا گیا اور وہ قازقستان کام کے لیے چلے گئے مگر حکام نے تورسنے کا پاسپورٹ اپنے پاس ہی رکھا اور انھی سنکیانگ میں پھنسا لیا۔

اطلاعات کے مطابق چینی حکام ملک سے جانے والوں کے رشتے داروں کو جان بوجھ کر حراست میں رکھتے ہیں تاکہ باہر جانے والے حکومت کے خلاف بیانات نہ دیں۔ 9 مارچ 2018 کو تورسنے سے کہا گیا کہ وہ ایک مقامی پولیس سٹیشن جائیں کیونکہ انھیں مزید 'تعلیم' کی ضرورت تھی۔ تورسنے کہتی ہیں کہ انھیں پھر اسی حراستی مرکز میں لے جایا گیا جہاں انھیں پہلے لے جایا گیا تھا۔ مگر اس مرتبہ وہ جگہ کافی بدل چکی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ اس مرتبہ حراستی مرکز کے باہر بسیں کھڑی تھیں اور ان بسوں سے نئے قیدی اُتار رہے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ خواتین سے ان کے زیور چھینے جا رہے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کے کانوں سے بالیاں ایسے کھینچی گئیں کہ ان کے کانوں سے خون نکلنا شروع ہو گیا۔ انھیں ایک کمرے میں دیگر خواتین کے ساتھ دھکیلا گیا جن میں ایک معمر خاتون بھی تھیں۔ بعد میں تورسنے اور اس خاتون کی دوستی ہو گئی۔ تورسنے کہتی ہیں کہ گارڈز نے اس معمر خاتون کا سکارف سر سے کھینچ کر اتار دیا اور وہ ان پر لمبا ڈریس (مکمل جسم ڈھانپنے والا لباس) پہننے پر چیخنے لگے۔ لمبا ڈریس پہننا اب اویغور کے لیے ایک ایسا جرم بن گیا ہے جس پر انھیں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ تورسنے کہتی ہیں کہ انھوں نے اس معمر خاتون کے سارے کپڑے اُتار دیے یہاں تک کہ وہ انڈر ویئر میں رہ گئیں۔ وہ اس قدر شرمندہ تھیں کہ ہاتھوں سے خود کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔' اس خاتون کے ساتھ ان کا رویہ دیکھ کر میں اتنا روئی۔ اور ان کے آنسو بارش کی طرح گر رہے تھے۔' تورسنے کہتی ہیں کہ خواتین سے کہا گیا کہ وہ اپنے جوتے اور ایسے تمام کپڑے جن میں الاسٹک یا بٹن ہوں، حکام کے حوالے کر دیں۔ پھر انھیں ان کے کمروں میں لے جایا گیا۔ پہلے ایک دو ماہ کچھ نہیں ہوا۔ انھیں اپنے کمروں میں پراپیگنڈا پروگرام زبردستی دکھائے گئے اور ان کے بال کاٹے گئے۔ پھر پولیس نے تورسنے سے ان کے شوہر کے بارے میں تفتیش شروع کر دی۔ اس دوران وہ انھیں لاتیں مارتے اور زمین پر پٹختے۔' پولیس کے بوٹ بہت سخت اور بھاری ہوتے ہیں۔ اس لیے میں پہلے سمجھی کہ وہ مجھے کسی اور چیز سے مار رہا ہے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے پیٹ پر چڑھ رہا ہے۔ میں تقریباً بے ہوش ہو گئی تھی۔'

کیمپ میں ایک ڈاکٹر نے انھیں بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے جسم میں کوئی بلڈ کلاٹ (خون کا لوتھڑا) بن گیا ہو۔ جب ان کی ساتھی قیدی حکام کو بتاتیں کہ تورسنے کا خون بہہ رہا ہے تو گارڈز کہتے تھے کہ' خواتین کا خون بہنا عام سی بات ہے۔ تورسنے کہتی ہیں کہ ہر کمرے میں 14 خواتین ہوتی تھیں۔ کھڑکیوں پر سلاخیں تھیں۔ ایک بیسن تھا اور زمین میں ایک سوراخ بیت الخلا کا کام دیتا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے پہلی مرتبہ خواتین کو رات کے وقت کمروں سے لے جانے کا عمل دیکھا تو انھیں سمجھ میں نہیں آیا کہ

کیا ہو رہا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ 'میں سمجھی انھیں کہیں اور لے جایا جا رہا ہے۔

وہ بتاتی ہیں کہ پھر 'مئی 2018 میں کسی وقت۔۔۔' مجھے درست تاریخ نہیں یاد کیونکہ وہاں اندر آپ کو تاریخیں نہیں یاد رہتیں'۔۔۔ تورسنے اور ایک نوجوان لڑکی کو رات کے وقت سیل سے نکالا گیا اور ماسک پہنے ایک چینی مرد کو پیش کیا گیا۔ ان کی ساتھی کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ تورسنے کہتی ہیں جیسے ہی وہ کمرے کے اندر گئی تو انھیں چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھی وہ اس پر تشدد کر رہے ہیں۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ اس کا ریپ ہو رہا ہے۔ جو خاتون تورسنے اور ان کی ساتھی کو لائی تھی اس نے ان مردوں کو تورسنے کی صحت اور خون بہنے کے بارے میں بتایا تو مرد اس پر چیخنے لگے۔ انھوں نے اس خاتون سے کہا کہ اسے کالے کمرے میں لے جاؤ۔ وہ خاتون مجھے وہاں لے گئی جہاں اس نوجوان لڑکی کو لے جایا گیا تھا۔ وہاں ان کے پاس ایک الیکٹرک ڈنڈا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا تھا۔ انھوں نے وہ میرے اندر ڈالا اور بجلی کے جھٹکے مارے۔ تورسنے کہتی ہیں کہ اس رات ان پر تشدد اس وقت ختم ہوا جب اسی خاتون نے مداخلت کی اور کہا کہ یہ بیمار ہے۔ آخر کار انھیں اپنے کمرے میں واپس بھیج دیا گیا۔

ایک گھنٹے بعد ان کے ساتھ جانے والی اس نوجوان لڑکی کو بھی لوٹا دیا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ 'اس کے بعد وہ لڑکی مکمل طور پر بدل گئی۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھی رہتی تھی جیسے وہ کسی صدمے میں ہو۔ ان کمروں میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو کہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ان کمروں کے علاوہ ان کیمپوں میں ایک اور اہم عنصر کلاس روم تھا۔ ان قیدیوں کی 'تربیتِ نو' کے لیے اساتذہ کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ سماجی کارکنان کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد اویغور اور دیگر اقلیتوں کو اپنے مذہب، زبان اور ثقافت سے ہٹا کر مرکزی دھارے کی چینی اقدار میں شامل کرنا تھا۔ سنکیانگ سے تعلق رکھنے والی ایک ازبک خاتون کلبنیر صادق یہاں چینی زبان کی استاد تھیں۔ انھیں زبردستی یہاں لایا گیا اور چینی زبان سکھانے پر مجبور کیا گیا۔ اب وہ چین سے بھاگ چکی ہیں اور اپنے تجربے کے بارے میں بتا رہی ہیں۔ انھوں نے بی بی سی کو بتایا کہ 'خواتین کے کیمپ میں بہت سختی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے افواہیں، اور کہانیاں سنی اور انھیں ریپ کے نشان بھی نظر آئے۔ ایک دن انھوں نے انتہائی محتاط انداز میں ایک چینی خاتون پولیس افسر سے بات کی جنھیں وہ جانتی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے ریپ کی انتہائی خوفناک کہانیاں سننے کو مل رہی ہیں۔ کیا آپ کو اس بارے میں پتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم صحن میں جا کر بات کریں گے۔ میں صحن میں گئی جہاں بہت سارے کیمرے نہیں ہوتے تھے۔ اس خاتون پولیس افسر نے کہا ہاں ریپ ایک عام بات بن گئی ہے۔ یہ گینگ ریپ ہے۔ چینی پولیس افسر نہ صرف انھیں ریپ کرتے ہیں بلکہ انھیں بجلی کے جھٹکے بھی لگاتے ہیں۔ یہ خوفناک تشدد ہے۔

میں اس پوری رات نہیں سوئی۔ میں اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کہ بیرونِ ملک پڑھ رہی تھی۔ میں ساری رات روتی رہی۔ اویغور ہیومن رائٹس پراجیکٹ سے بات کرتے ہوئے کلبنیر صادق نے بتایا کہ انھوں نے خواتین کے اندر بجلی کے ڈنڈے ڈال کر انھیں جھٹکے دینے کی کہانیاں سنی ہیں۔ یہ تورسنے کے دعوؤں کی تائید کرتا ہے۔ کلبنیر کہتی ہیں کہ چار قسم کے برقی جھٹکے دیے جاتے تھے۔۔۔ دستانہ، ہیلمٹ، کرسی اور کسی ڈنڈے سے ریپ۔ وہ کہتی ہیں کہ عمارت میں چیخوں کی آوازیں گونجتی تھیں۔ مجھے کبھی دوپہر کے کھانے کے دوران آوازیں آتی تھیں، کبھی کلاس کے دوران۔ ایک اور استاد جنھیں اس کیمپس میں پڑھانے پر مجبور کیا گیا، سیرا گل سوئتبے نے بی بی سی کو بتایا کہ 'ریپ عام بات تھی' اور گارڈ' اپنی مرضی کی نوجوان لڑکیاں اور خواتین کو اٹھاتے تھے اور لے جاتے تھے۔ انھوں نے ایک 20 یا 21 سالہ لڑکی کی خوفناک کہانی سنائی جسے گینگ ریپ کیا گیا اور تقریباً 100 قیدیوں کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا اور اس سے زبردستی اقرارِ جرم کروایا گیا۔ سیرا گل کہتی ہیں کہ پھر سب کے سامنے پولیس والوں نے باری باری اس کا ریپ کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ اس دوران حکام نے قیدیوں پر نظر رکھی ہوئی تھی کہ کون مزاحمت کر رہا ہے، کون اپنی آنکھیں بند کر رہا ہے، کون دوسری جانب دیکھ رہا ہے، کون مٹھیاں بند کر رہا ہے۔۔۔ پھر ان لوگوں کو سزا کے لیے لے جایا گیا۔

سیرا گل کہتی ہیں کہ اس دوران وہ بچی مدد کے لیے پکارتی رہی۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ بہت خوفناک تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں مر گئی ہوں۔ میں مردہ تھی۔ اس کیمپ میں تورسنے کے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ قیدیوں کے بال کاٹے جاتے، ان پر غیر واضح قسم کے طبی ٹیسٹ کیے جاتے، انھیں دوائیاں دی جاتیں، اور ہر پندرہ دن کے بعد انھیں ایک 'حفاظتی ٹیکا' لگایا جاتا جس سے جسم کا سُن ہونا اور الٹی آنا عام بات تھی۔ خواتین میں زبردستی مانع حمل آئی یوڈی ڈال دی جاتی یا انھیں بانجھ کر دیا جاتا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی ایک تحقیق کے مطابق سنکیانگ میں اویغوروں کو بانجھ کرنا ایک عام سی بات ہے۔ چینی حکومت نے بی بی سی کو بتایا کہ یہ تمام الزامات جھوٹے ہیں۔ سیرا گل کہتی ہیں کہ طبی مداخلتوں کے علاوہ قیدیوں کو کئی گھنٹوں تک چینی ملی نغمے گانے پڑتے، چینی صدر کے بارے میں محب الوطن پروگرام دیکھنے پڑتے۔ 'آپ کیمپ کے باہر زندگی کے بارے میں بھول جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ ان کی ذہن سازی کا نتیجہ تھا یا ان ٹیکوں اور دوائیوں کا کہ آپ کھانے کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ سکتے

تھے۔کھانے کی شدید قلت تھی۔چین سے باہر ایک ملک سے ویڈیو لنک کے ذریعے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے ایک سابق گارڈ نے بتایا کہ جب قیدی کوئی غلطی کرتے تھے جیسے کہ صدر شی کے بارے میں کسی کتاب کا کوئی حصہ صحیح سے یاد نہیں کرتے تھے تو انھیں بطور سزا بھوکا رکھا جاتا تھا۔

اس گارڈ کا کہنا تھا کہ ایک دفعہ انھوں نے دیکھا کہ لوگوں کو کیمپ میں لے جایا جا رہا تھا تو ان سب کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ سب کئی گھنٹوں تک اسے یاد کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔جو لوگ ٹیسٹ میں ناکام ہوئے انھیں اس کی بنا پر تین مختلف رنگوں کے کپڑے پہننے پڑے یعنی کپڑوں سے پتا چلتا تھا کہ آپ ٹیسٹ میں کتنی مرتبہ ناکام ہوئے ہیں۔اور اس کی بنا پر آپ کو مختلف قسم کی سزائیں ملتی تھیں جن میں مار پیٹ اور بھوکا رکھا جانا شامل ہے۔اس گارڈ کے دعوؤں کی آزادانہ تصدیق تو نہیں ہو سکی ہے۔ مگر انھوں نے کچھ ایسے دستاویزات پیش کیے ہیں جو اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ وہ ان کیمپوں میں ملازم رہے تھے۔انھوں نے ہم سے بات اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر کی۔تاہم گارڈ کا کہنا ہے کہ انھیں قیدیوں کے ریپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا حکام بجلی کے جھٹکے دیتے تھے تو انھوں نے ہاں وہ برقی جھٹکے دینے والے آلات استعمال کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ سزا کے بعد قیدیوں سے مختلف قسم کے جرائم کا اعتراف کروایا جاتا تھا۔وہ کہتے ہیں کہ یہ اعتراف میرے دل میں چھپے ہیں۔ان کیمپوں میں صدر شی کا عکس واضح ہے۔ان کی تصاویر ان کے کلیات دیواروں کی زینت ہیں۔وہ اس 'تعلیمِ نو' کے پروگرام کا مرکز ہیں۔ ایک سابق برطانوی سفارتکار جنھوں نے چین میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کی ہے کہتے ہیں کہ صدر شی ہی اویغور کے خلاف پالسی بنانے والے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ 'یہ پالیسی انتہائی سینٹرلائزڈ ہے اور یہ اوپر تک جاتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صدر شی کی اپنی پالیسی ہے۔تاہم ان کا کہنا تھا کہ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ صدر شی یا دیگر اعلیٰ سطحی حکام نے خود ریپ کی اجازت دی ہو۔مگر انھیں پتا ضرور ہو گا۔میرے خیال میں اعلیٰ ترین سطح پر وہ اس پر توجہ دینا پسند نہیں کرتے۔حکم گیا ہے کہ سختی سے پالیسی پر عمل کیا جائے اور یہی ہو رہا ہے۔اس پر کوئی پابندیاں نہیں لگائی گئی ہیں۔مجھے یہ نہیں نظر آتا کہ اس پالیسی پر عمل کروانے والوں کو کس چیز سے روکنا ہو گا۔اور تورسنے کے مطابق وہ کسی چیز سے رُکتے بھی نہیں تھے۔وہ صرف ریپ نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ کے پورے جسم پر دانتوں سے کاٹتے بھی تھے۔پتا نہیں وہ انسان تھے یا جانور۔

❁❁❁

غزل

نسیم ساز اعظم گڑھ انڈیا

بہت مشکل ہے شہر اجنبی میں
تمہیں ڈھونڈھے گا کوئی کس گلی میں

خدا جانے کہاں سے آ بسی ہے
یہ حیوانوں کی فطرت آدمی میں

نہ پہنچیں گی دعائیں آسمان تک
اگر ہوگا دکھاوا بندگی میں

ابھی سے ہار کر ہمت نہ بیٹھو
مراحل اور بھی ہیں زندگی میں

جسے کہتے ہیں الفت کا خزانہ
یہ ملتا ہے کہاں اب ہر کسی میں

میں سچ کہتا ہوں یہ ممکن نہیں ہے
کوئی تجھ سا ملے گا اس صدی میں

یہ حسرت ساز اب ہوتی ہے مجھکو
رہا ہوتا میں ماں کی گود ہی میں

❁❁❁

Lahore International Magazine
Instagram: @lahoreintl
Twitter: @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

’امریکی تاریخ کی واحد بغاوت‘

تحریر: ٹوبی لکہرسٹ

ایک زمانے کی بات ہے جب امریکہ میں سیاست دانوں نے ایک ہجوم کو اس قدر ہوا دی کہ مشتعل ہجوم پر تشدد ہو گیا اور منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اپنے ہی شہر کو تاراج (تباہ) کرنے لگا۔ سنہ 1898 کے ریاستی انتخابات کے بعد سفید فاموں کی برتری کے نظریات کے حامل افراد نے شمالی کیرولائنا کے اس وقت کے سب سے بڑے بندرگاہ والے شہر ولمنگٹن کا رخ کیا۔ انھوں نے سیاہ فام ملکیت والے کاروبار تباہ کر دیے، سیاہ فام باشندوں کا قتل عام کیا اور سفید فام اور سیاہ فام سیاستدانوں کے اتحاد سے منتخب مقامی حکومت کو زبردستی مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ دانوں نے اسے امریکی تاریخ کی واحد بغاوت سے تعبیر کیا ہے۔ سفید فام نسل پرستوں کے سرغنوں نے بغاوت کے ہی دن اقتدار سنبھال لیا اور ریاست کی سیاہ فام آبادی سے ووٹ ڈالنے اور دوسرے شہری حقوق چھیننے کے لیے تیزی سے قانون بنائے اور ان سب کے باوجود انھیں کسی قسم کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑا۔ ولمنگٹن کی کہانی کا تذکرہ دوبارہ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب ایک مشتعل ہجوم نے چھ جنوری کو امریکہ کے کیپٹل ہل کو نشانہ بنایا اور نومبر کے صدارتی انتخابی نتائج کی توثیق کو روکنے کی کوشش کی۔ بغاوت کے 120 سال بعد بھی یہ شہر اپنے پُرتشدد ماضی کی گرفت میں ہے۔ سنہ 1865 میں امریکی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد نومتحد پورے ملک میں غلامی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ خانہ جنگی میں شمالی یونینسٹ ریاستیں جنوبی کنفیڈریسی کے خلاف تھیں۔ واشنگٹن ڈی سی میں سیاستدانوں نے سابقہ غلاموں کی آزادی اور حقوق کی فراہمی کے لیے متعدد آئینی ترامیم منظور کیں اور اپنی پالیسیوں کو نافذ کرنے کے لیے جگہ جگہ فوج کو روانہ کیا۔ لیکن بہت سے جنوبی لوگوں نے ان تبدیلیوں پر ناراضگی ظاہر کی۔ خانہ جنگی کے بعد آنے والی دہائیوں میں آزاد سیاہ فام آبادی کو معاشرے میں ضم کرنے کی بہت سے کوششوں کو پلٹنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔

سنہ 1898 میں ولمنگٹن ایک بڑی اور خوشحال بندرگاہ تھی جہاں سیاہ فام آبادی کا ترقی پذیر متوسط طبقہ آباد تھا۔ بلاشبہ افریقی امریکیوں کو اس کے بعد بھی روزانہ تعصب اور امتیازی سلوک کا سامنا تھا، مثال کے طور پر بینک کا سیاہ فام لوگوں کو قرض دینے سے انکار یا سود کی زیادہ شرح عائد کرنا وغیرہ۔ لیکن خانہ جنگی کے 30 سال بعد شمالی کیرولائنا جیسی سابقہ کنفیڈریٹ ریاستوں میں افریقی امریکی آہستہ آہستہ اپنا کاروبار قائم کر رہے تھے، مکان خرید رہے تھے اور اپنی آزادی کا استعمال کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ولمنگٹن کو اس وقت سیاہ فاموں کا گھر سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس وقت ملک کا واحد سیاہ فام روزنامہ (ولمنگٹن ڈیلی ریکارڈ) وہاں سے نکلتا تھا۔ ییل یونیورسٹی میں تاریخ کی پروفیسر گلینڈا گلمور نے کو بتایا: افریقی امریکی کافی کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ یونیورسٹیوں میں جا رہے تھے، ان کی شرح خواندگی میں اضافہ ہو رہا تھا اور جائیداد کی ملکیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سفید فام نسل پرستوں نے ولمنگٹن ڈیلی ریکارڈ کے دفتر کو آگ لگا دی

یہ بڑھتی ہوئی کامیابی نہ صرف معاشرتی بلکہ سیاسی طور پر پورے شمالی کیرولائنا میں دیکھی جا رہی تھی۔ سنہ 1890 کی دہائی میں سفید فام اور سیاہ فام کے سیاسی اتحاد نے جسے فیوژنسٹ کہا گیا مفت تعلیم، قرض سے نجات اور افریقی امریکیوں کے مساوی حقوق کے نام پر سنہ 1896 میں گورنری سمیت ہر ریاست کے ہر دفتر میں جیت حاصل کی تھی۔ سنہ 1898 تک سیاہ فام اور سفید فیوژنسٹ سیاست دانوں کے ایک اتحاد کو ولمنگٹن میں مقامی شہری حکومت کی قیادت کے لیے منتخب کیا گیا۔ لیکن ڈیموکریٹک پارٹی سمیت اس کے خلاف بہت بڑا ردعمل سامنے آیا۔ سنہ 1890 کی دہائی میں ڈیموکریٹس اور ریپبلکن آج کے دور سے بہت مختلف تھے۔ صدر ابراہیم لنکن کی جماعت ریپبلکن امریکی خانہ جنگی کے بعد نسلی اتحاد اور ریاستوں کو متحد کرنے کے

لیے واشنگٹن ڈی سی کی مضبوط حکومت کی حامی تھی۔لیکن ڈیموکریٹس امریکہ میں ہونے والی بہت سی تبدیلیوں کے خلاف تھے۔ انھوں نے ریاستوں کے لیے نسلی بنیاد پر علیحدگی اور مضبوط حقوق کا کھلے عام مطالبہ کیا۔ ولمنگٹن کی بغاوت سے متعلق ایک کتاب(اے ڈے آف بلڈ) کی مصنف اور ریاستی آرکائیوسٹ لی رائی امفلیٹ نے کو بتایا: سنہ 1898 کی ڈیموکریٹک پارٹی کو سفید فام کی بالادستی والا پارٹی کے طور پر دیکھیں۔ڈیموکریٹ سیاستدانوں کو خدشہ تھا کہ سیاہ فام ری پبلیکنز کے ساتھ ساتھ غریب سفید فام کسانوں کی پارٹی فیوژنسٹ سنہ 1898 کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرلے گی۔ پارٹی رہنماؤں نے سفید فام بالادستی کی بنیاد پر انتخابی مہم چلانے کا فیصلہ کیا اور فیوژنسٹوں کو شکست دینے کے لیے اپنے اقتدار میں ہر چیز کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مز امفلیٹ نے کہا: اس بات کو یقینی بنانے کے لیے انھوں نے اخبارات، مقرروں اور دھمکی آمیز ہتھکنڈوں کے استعمال کی مشترکہ کوشش کی تاکہ سفید بالادستی والے پلیٹ فارم نومبر 1898 کے انتخابات میں کامیابی حاصل کریں۔ وائٹ ملیشیا جنھیں ان کی وردی کی وجہ سے (ریڈ شرٹس) کے نام سے جانا جاتا تھا وہ گروہوں کی شکل میں گھوڑوں پر سوار ہوکر سیاہ فام لوگوں پر حملہ کرتے اور ووٹروں کو ڈراتے دھمکاتے تھے۔ جب ولمنگٹن میں سیاہ فام افراد نے اپنی املاک کے تحفظ کے لیے بندوقیں خریدنے کی کوشش کرتے تو سفید فام دکان دار انھیں بندوق فروخت کرنے سے انکار کردیتے اور ان کی ایک فہرست بناتے جنھیں گن اور کارتوس مطلوب تھے۔

اس دوران اخبارات میں یہ دعویٰ کیا جاتا رہا کہ افریقی امریکی سیاسی طاقت چاہتے ہیں تاکہ وہ سفید فام خواتین کے ساتھ ہم بستری کرسکیں اور عصمت دری کی وبا کے بارے میں افواہیں پھیلائی جاتیں۔ جب ولمنگٹن ڈیلی ریکارڈ کے مالک اور ایڈیٹر الیگزینڈر مینلی نے عصمت دری کے الزامات پر سوالات کرتے ہوئے ایک ایڈیٹوریل شائع کیا اور یہ لکھا کہ سفید فام خواتین اپنی مرضی سے سیاہ فام مردوں کے ساتھ سوتی ہیں تو ڈیموکریٹک پارٹی مشتعل ہوگئی اور اس نے انھیں نفرت کی مہم کا نشانہ بنایا۔سنہ 1898 میں ہونے والے ریاستی انتخابات سے ایک دن قبل ڈیموکریٹک سیاستدان الفریڈ موروویڈیل نے شعلہ بیان تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سفید فام مردو(آپ اپنا فرض ادا کریں) اور ووٹ ڈالنے والے سیاہ فام لوگوں کو تلاش کریں۔

اور اگر آپ کو کوئی مل جاتا ہے تو اس سے کہو کہ وہ پولنگ چھوڑ کر چلا جائے اور اگر وہ مزاحمت کرتو اسے ماردیں، ان کے نچلے حصے میں گولی ماردیں۔ اگر ہمیں ایسا بندوق سے کرنا پڑا تو ہم کل جیت جائیں گے۔ڈیموکریٹک پارٹی نے ریاستی انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ تشدد کے خوف سے بہت سارے ووٹروں ووٹ نہیں دیا جبکہ بہت سے لوگوں کو گن پوائنٹ پر پولنگ سٹیشنوں سے دور رہنے پر مجبور کیا گیا۔لیکن ولمنگٹن میں فیوژنسٹ سیاستدان برسراقتدار رہے جبکہ اگلے سال تک بلدیاتی انتخابات نہیں ہونے تھے۔ ریاستی انتخابات کے دو دن بعد سینکڑوں مسلح سفید فام افراد شہر میں گھوڑے پر سوار پہنچے اور ولمنگٹن ڈیلی ریکارڈ کی عمارت کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد وہ سیاہ فام لوگوں کو ہلاک کرنے اور ان کے کاروبار کو تباہ کرنے کے لیے شہر میں پھیل گئے۔ دن چڑھنے کے ساتھ سفید فام لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔سیاہ فام باشندے شہر سے باہر جنگل میں بھاگنے لگے پھر ویڈیل اور اس کا گروپ سٹی ہال پہنچا اور بندوق کی نوک پر مقامی حکومت کو استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا۔اسی دوپہر ویڈیل کے میئر بننے کا اعلان کیا گیا۔

پروفیسر گلمور نے کہا: یہ مکمل طور پر بغاوت تھی، ریاستی حکومت اور مقامی حکومت کے خلاف ایک مکمل بغاوت تھی۔ دو برسوں کے اندر شمالی کیرولائنا میں سفید فام بالادستی پرستوں نے تقسیم کے نئے قانون نافذ کیے جس کے تحت سیاہ فاموں سے خواندگی کے امتحانات اور پول ٹیکس کے نام پر موثر طریقے پر ووٹ دینے کا حق چھین لیا گیا۔ مبینہ طور پر رجسٹرڈ افریقی امریکی ووٹروں کی تعداد 1896 میں ایک لاکھ 25 ہزار سے کم ہوکر 1902 میں تقریباً چھ ہزار رہ گئی۔ پروفیسر گلمور نے کہا: ولمنگٹن میں سیاہ فام لوگوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسا کبھی ہوگا۔ ریاست میں ایک ریپبلکن گورنر تھا، ان کا کانگریس مین ایک سیاہ فام آدمی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ معاملات واقعتاً بہتر ہورہے ہیں۔لیکن اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ معاملات جتنے بہتر ہوئے گورے لوگوں نے اتنی ہی سخت جدوجہد کی۔ ڈیبوراہ ڈکس میکسویل ولمنگٹن میں نیشنل ایسوسی ایشن فار ایڈوانسمنٹ آف کلرڈ پیپل کی مقامی شاخ کی صدر ہیں۔ وہ اسی شہر میں پیدا ہوئیں اور پرورش پائی لیکن انھیں اس حملے کے بارے میں اس وقت تک کوئی علم نہیں تھا جب تک کہ وہ اپنی 30 کی دہائی میں نہیں آگئیں۔ انھوں نے بتایا: یہ وہ بات تھی جو یہاں ولمنگٹن میں آنے والے جانتے تھے لیکن اس کے بارے میں وسیع پیمانے پر بات نہیں کی جاتی تھی۔ یہ سکول کے نصاب میں اس طرح نہیں ہے جیسے ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی یہ بات تسلیم نہیں کرنا چاہتا ہے۔سنہ 1990 کی دہائی تک اس شہر کے لوگوں نے اپنے ماضی پر تبادلہ خیال کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ سنہ 1998 میں مقامی حکام نے حملے کی 100 ویں سالگرہ منائی اور دو سال بعد حقائق کو سامنے لانے کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا۔

اس وقت سے اس شہر نے واقعات کی یاد دلانے کے لیے اہم مقامات پر تختیاں لگائیں اور 1898 کی یادگار اور میموریل پارک قائم کیا جو مزڈکس میکسویل کے نزدیک (چھوٹا لیکن اہم) قدم ہے۔ اس شہر پر جو کچھ گزری اس کے باوجود اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہاں کے باشندے اور مؤرخین جو وہاں کے ماضی سے روشناس ہیں وہ رواں مہینے امریکی دارالحکومت میں کیپیٹل ہل پر حملے اور سنہ 1898 کے حملے درمیان مماثلت دیکھیں۔ مزڈکس میکسویل اور ان کی این اے اے سی پی برانچ امریکی انتخابات کے بعد کئی مہینوں سے اس بات کو اجاگر کر رہی ہیں کہ ولمنگٹن میں پیش آنے والے واقعات اور آج کے واقعات کے درمیان مماثلت ہے اور آج کل امریکی سیاستدان انتخابی نتائج کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: اس دن صبح ہم نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں ٹرمپ کی حمایت کرنے پر اپنے مقامی کانگریس مین کی یہ کہتے ہوئے مذمت کی کہ ایک ممکنہ بغاوت ہوسکتی ہے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس ملک میں دوسری بار کوئی بغاوت ہو۔ اور اس کے کچھ ہی گھنٹوں کے بعد ہجوم نے امریکی کیپیٹل کی جانب مارچ کیا۔ کرسٹوفر ایوریٹ ایک دستاویزی فلم ساز ہیں۔ انھوں نے 1898 میں بغاوت کے متعلق (ولمنگٹن آن فائر) نامی فلم ایک فلم بنائی۔ جب مسٹر ایوریٹ نے کیپٹل پر حملہ دیکھا تو انھیں ولمنگٹن کا خیال کوند آیا۔ انھوں نے بتایا: سنہ 1898 کی بغاوت کے لیے کسی کو بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ لہذا اس نے ان کے سیلاب کا راستہ کھول دیا، خاص طور پر جنوب میں افریقی امریکیوں کے شہری حقوق چھیننے کے لیے۔ واشنگٹن ڈی سی کی بغاوت کے بعد یہ سب سے پہلی چیز تھی جو میرے ذہن میں آئی کہ آپ اس طرح کی کسی اور چیز یا اس سے بھی بدتر کے لیے دروازہ کھول رہے ہیں۔ سنہ 1898 کے حملے کو چھپایا نہیں گیا۔ ریاست کی یونیورسٹیوں کی عمارتوں، سکولوں اور سرکاری عمارتوں کو سبھی نے اس بغاوت کو بھڑکانے والوں کا نام دیا۔ بعد میں لوگ اس حملے میں شامل ہونے کا دعویٰ کرنے لگے تاکہ ڈیموکریٹک پارٹی میں اپنے قد کو بڑھا سکیں۔ جیسے جیسے دہائیاں گزرتی گئیں تاریخ کی کتابوں میں یہ دعویٰ کرنا شروع کیا گیا کہ حقیقت میں یہ ایک نسلی فساد تھا جسے سیاہ فام آبادی نے شروع کیا تھا اور سفید فام شہریوں نے اسے ختم کیا تھا۔ مسٹر ایوریٹ نے کہا: قتل عام کے بعد بھی ان میں سے بہت سارے لوگوں نے، جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا اور اس کا ارتکاب کیا تھا، ان کے پورے ملک میں اور خاص طور پر شمالی کیرولائینا میں مجسمے لگائے گئے اور عمارتوں کے نام ان سے منسوب کیے گئے۔ چارلس آئیکاک جو کہ سفید فام کی بالادستی کے لیے چلائی جانے والی انتخابی مہم کے منتظمین میں سے تھے وہ سنہ 1901 میں شمالی کیرولائنا کے گورنر بن گئے۔ ان کا مجسمہ اب امریکی کیپیٹل ہل میں نصب ہے جہاں چھ جنوری کو ہنگامہ آرائی کرنے والے داخل ہوئے۔ مسٹر ایوریٹ اب اپنی دستاویزی فلم کا ایک سیکوئل بنا رہے ہیں تاکہ یہ پتا چلائیں کہ ولمنگٹن اپنے ماضی سے کس طرح جکڑا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سارے مقامی رہنما (ولمنگٹن شہر کو 1897 کے جذبے والے دور میں واپس لانے کے لیے کام کر رہے ہیں جہاں خانہ جنگی کے بعد سفید فام اور سیاہ فام ساتھ مل کر کام کر رہے تھے کہ ولمنگٹن کو ایک نئے جنوب کے لیے مثال بنائیں گے۔)

انھوں نے کہا: ولمنگٹن بغاوت کے ساتھ سفید فام بالادستی کی تحریک کا ایک نمونہ تھا۔ لیکن اب ولمنگٹن یہ بھی بتانے کے لیے ایک ماڈل بن سکتا ہے کہ ہم مل کر کیسے کام کر سکتے ہیں اور سفید فام بالادستی کے داغ کو ختم کر سکتے ہیں۔

❁❁❁

اعلان تقرری

محترم انس احمد ولد عبدالرحمن کو ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل لندن کی جانب سے بطور "بیورو چیف لاہور" برائے سال یکم مارچ 2021 تا 2023 کی تقرری عمل میں لائی جارہی ہے۔ تمام سرکاری وغیر سرکاری ادارے نوٹ فرمالیں اور ان سے ہر ممکن تعاون کی درخواست ہے۔ موصوف کا تعارف یہ ہے آپ صحافت کے میدان میں سنہ 2000 سے وابستہ ہیں اور پاکستان کے اہم اخبارات جنگ، نوائے وقت، ایکسپریس نیوز اور دیگر میں بطور رپورٹر سرانجام دے چکے ہیں اور پاکستان کی صحافت کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اپ ہیومن رائٹس آف پاکستان (HRCP) کے بطور نمائندہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اپ نہایت محنتی، قابل اعتماد، باہمت اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی، مذہبی اور سیاسی حلقوں میں انکا ایک خاص مقام ہے۔ ہمارے ادارہ کے لیے انکی تقرری باعث صد افتخار ہے۔ اللہ تعالی انکی تقرری کو تمام احباب کے لیے مبارک کرے۔ آمین

محی الدین عباسی چیف ایڈیٹر لاہور انٹرنیشنل لندن

گل بہار مسلمان لڑکی جس کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کوڑے کھانے قبول کیے

تحریر: عمر دراز ننگیانہ

اُن کی عمر محض اٹھارہ برس کے قریب تھی اور وہ پیشہ ور رقاصہ اور گائیک تھیں۔ مگر ایک ہی ملاقات میں اُن کے حُسن اور آواز کے سحر نے حاکمِ وقت کو اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے کوڑے کھانے پر بھی تیار ہو گئے۔ یہ لڑکی امرتسر کی گل بہار تھیں۔ پنجاب کے حاکم مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلی مرتبہ انھیں ایک شاہی محفل میں گاتے سُنا اور دیکھا۔ اسی وقت مہاراجہ نے گل بہار کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ انھیں اپنی محبوبہ بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ مگر گل بہار نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پنجاب کی تاریخ پر نظر رکھنے والے محقق اور مصنف اقبال قیصر کے مطابق رنجیت سنگھ ان پر اس قدر فریفتہ تھے کہ اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار تھے۔ 'گل بہار ایک مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے انھوں نے رنجیت کو کہا کہ وہ محبوبہ بن کر نہیں رہ سکتیں۔ اس وقت مہاراجہ کی عمر 50 برس سے زیادہ تھی اور یہ وہ دور تھا جب انگریز نے برصغیر میں قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ گل بہار نے پیشکش کی کہ اگر مہاراجہ چاہیں تو وہ ان سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ اقبال قیصر بتاتے ہیں کہ 'مہاراجہ رنجیت سنگھ اس قدر جذباتی ہوئے کہ انھوں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔' پنجاب کے مہاراجہ نے گل بہار کے گھر والوں سے باقاعدہ طور پر ان کا ہاتھ مانگا۔ ایک روایت کے مطابق گل بہار نے شادی کی پیشکش کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ رنجیت سنگھ ان کے گھر والوں سے رشتہ مانگنے کے لیے خود پیدل چل کر لاہور سے امرتسر آئیں گے۔ تاہم اقبال قیصر کے مطابق مستند تاریخ کی کتابوں سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ تاہم پنجاب کے مہاراجہ کے لیے بھی سکھ مذہب سے باہر ایک مسلمان لڑکی سے باقاعدہ شادی کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

'اکال تخت نے رنجیت کو کوڑوں کی سزا سنائی'

سکھ مذہب کے مذہبی افراد نے رنجیت سنگھ کے اس فیصلے کا بہت بُرا منایا۔ مہاراجہ کو امرتسر میں واقع سکھوں کی مقدس عبادت گاہ اکال تخت پر طلب کر لیا گیا۔ اکال تخت کو سکھ مذہب میں زمین پر خالصہ کی اعلیٰ ترین جائے حاکمیت تصور کیا جاتا ہے۔ بعض تاریخی حوالوں کے مطابق اکال تخت نے گل بہار سے شادی کرنے پر سزا کے طور پر رنجیت سنگھ کو اپنے ہاتھوں سے پورے گرودوارے کے فرش کو دھونے اور اسے صاف کرنے کی سزا دی۔ تاہم اقبال قیصر کہتے ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق ایسا نہیں تھا۔ 'اکال تخت نے رنجیت سنگھ کو کوڑے لگانے کی سزا دی۔ اپنی اس ملکہ کے لیے رنجیت سنگھ نے یہ سزا بھی قبول کی۔

کیا واقعی رنجیت سنگھ کو کوڑے لگائے گئے؟

اس وقت رنجیت سنگھ کی عمر 50 برس سے زیادہ تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ مہاراجہ تھے جن کی سلطنت کی حدیں پنجاب سے باہر بھی چلی جاتی تھیں۔ اس قدر بااثر شخصیت کو کوڑے کون لگا سکتا تھا؟ دوسری طرف اکال تخت کا حکم بھی تھا جو رد کرنا رنجیت سنگھ کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ اقبال قیصر کے مطابق 'اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ریشم کا کوڑا تیار کیا گیا اور اس کے ساتھ رنجیت سنگھ کو کوڑے لگائے گئے اور حد پوری کی گئی۔ وہ کہتے ہیں اس طرح مہاراجہ نے 'کوڑے بھی کھا لیے اور گل بہار کو بھی نہیں چھوڑا۔ رنجیت سنگھ اور گل بہار کی شادی اور اس پر ہونے والے جشن کو کئی مؤرخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جن بڑے بوڑھوں نے اس شادی کو لاہور اور امرتسر میں دیکھا تھا وہ بعد میں یاد کرتے تھے کہ یہاں کبھی ایسی شادی بھی ہوئی تھی۔

'رنجیت نے باقاعدہ مہندی لگائی'

محقق اقبال قیصر بتاتے ہیں کہ اس شادی کا احوال مؤرخ سجان رائے نے اپنی ایک کتاب 'خلاصہ تواریخ' میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'مہاراجہ رنجیت سنگھ نے باقاعدہ

طور پر مہندی لگوائی، طلائی زیورات زیب تن کیے، اپنا شاہی لباس پہنا اور ہاتھی پر سوار ہوئے۔ امرتسر کے رام باغ میں ایک بنگلہ تھا جس میں یہ شادی کی تقریب منعقد ہونا تھی۔ اس بنگلے کو چند روز قبل بند کر دیا گیا اور کئی روز تک اس کی تزین و آرائش کی گئی۔ اس کو خالی کروالیا گیا تھا اور اس کے بعد جو پہلا شخص اس میں داخل ہوا وہ گل بہار تھیں۔

شادی کی تقریب سے ایک رات قبل اس میں محفلِ موسیقی منعقد ہوئی، مجرے ہوئے اور چراغاں کیا گیا۔ 'اس محفل میں گانے والوں کو انعام میں سات ہزار روپے دیے گئے۔ یہ اس وقت ایک بہت بڑی رقم تھی۔'

'گل بہار کے گزرنے کے لیے راوی کے نالے پر پل تعمیر کیا گیا'

شادی کی تقریب دھوم دھام سے ہوئی جس کے بعد شاہی جوڑا امرتسر سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن لاہور میں داخل ہونے سے قبل دریائے راوی کا ایک چھوٹا سا نالہ ان کے راستے میں حائل ہو گیا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ پیدل چل کر اس کو عبور کر سکتا تھا لیکن گل بہار اب لاہور کی ملکہ تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ملکہ پالکی سے اتر کر پیدل چل کر نالہ عبور کرتیں۔ گل بہار نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اقبال قیصر کے مطابق 'کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نالے کے اوپر ایک پل تعمیر کیا گیا جس پر چل کر ملکہ نے نالہ عبور کیا۔ بعد میں یہ 'پُل کنجری' کے نام سے مشہور ہوا۔ اقبال قیصر کے مطابق اس کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے اور پاکستان اور انڈیا کے درمیان سنہ 1971 کی جنگ کے دوران یہ پل کافی زیادہ خبروں میں رہا تھا۔ تاہم بعض روایات کے مطابق یہ پل وہ مقام ہے جہاں رنجیت سنگھ امرتسر کی طرف سفر کے دوران قیام کرتے تھے۔ اس کے لیے بنائی جانے والی تعمیرات آج بھی یہاں موجود ہیں۔ اس روایت کے مطابق اس پل کا نام 'پُل کنجری' رنجیت سنگھ کی محبوبہ موراں سرکار سے منسوب کیا جاتا ہے جس نے پیدل چل کر نالہ عبور کرنے پر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

کیا گل بیگم نے اپنا مقبرہ خود تعمیر کروایا؟

گل بیگم سے شادی کے آٹھ برس بعد رنجیت سنگھ کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ میں انگریز پنجاب پر پوری طرح قابض ہو گئے۔ رنجیت سنگھ کی آخری بیگم جنداں کو دیس نکالا دیا گیا کیونکہ ان کے بیٹے دلیپ سنگھ کو ہی رنجیت کا جانشین مقرر کیا گیا تھا۔ بہار بیگم کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے ان سے انگریز سرکار کو خطرہ نہیں تھا۔ مہاراجہ کی اہلیہ ہونے کے ناطے گل بیگم کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو ماہانہ 1200 روپے کے لگ بھگ تھا۔ گل بیگم نے ایک مسلمان لڑکے سردار خان کو گود لے رکھا تھا۔ سنہ 1851 میں گل بیگم نے اپنے لیے لاہور کے قدیمی میانی صاحب قبرستان کے پہلو میں ایک باغ تعمیر کروایا۔ اقبال قیصر کے مطابق اسی باغ میں انھوں نے اپنا مقبرہ بھی تعمیر کروایا۔ اس کی دیواروں پر بنے نقش و نگار تو مٹ چکے ہیں تاہم مقبرے کے اندر چھت اور دیواروں پر بنے خوبصورت نقوش آج بھی ایسے موجود ہیں جیسے کل ہی میں بنائے گئے ہوں۔

'یہ اجڑا دیار کبھی لاہور کی ملکہ تھی'

اس باغ کی تعمیر کے تقریباً دس برس بعد گل بیگم کی بھی وفات ہو گئی اور انھیں اسی مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اقبال قیصر کہتے ہیں 'اس مقبرے کے اندر جو فریسکوز بنے ہوئے ہیں وہ انتہائی قیمتی ہیں۔ پہلے سے مغلیہ دور چلا آ رہا تھا، پھر اس میں سکھ شامل ہو گئے اور یہ سب اپنے عروج کی شکل میں اس مقبرے میں موجود ہے۔

باغ گل بیگم آج بھی اسی جگہ موجود ہے تاہم اس کی حالت انتہائی خستہ حال ہو چکی ہے۔ اقبال قیصر کے مطابق 'یہ اجڑا دیار کبھی لاہور کی ملکہ رہنے والی خاتون کا مقبرہ تھا۔

اقبال قیصر بتاتے ہیں کہ گل بیگم کے پاس اتنی بڑی جائیداد اور جاگیر تھی کہ اس کو سنبھالنے کے لیے انھوں نے اپنا ایک مال خانہ بنا رکھا تھا اور وہ خود اس کا انتظام سنبھالتی تھیں۔ ان کی موت کے بعد یہ جائیداد ان کے لے پالک بیٹے سردار خان کو منتقل ہو گئی۔ جس جگہ آج یہ باغ موجود ہے اس کے اردگرد سردار خان کا خاندان آج بھی آباد ہے۔ باغ گل بیگم بھی ان ہی کی ملکیت ہے اور اس علاقے کو محلہ گل بیگم کہا جاتا تھا۔ سردار خان کی قبر بھی اسی باغ کے وسط میں ایک احاطے کے اندر موجود ہے۔

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی
توسیع اشاعت میں حصہ لینا
آپ کا قومی فرض ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

اقوام متحدہ کا شہزادی لطیفہ کی قید کا معاملہ متحدہ عرب امارات کے ساتھ

اقوام متحدہ نے دبئی کے حکمران شیخ محمد بن راشد المکتوم کی بیٹی شہزادی لطیفہ کو والد کی جانب سے جبری طور پر قید کرنے کا معاملہ متحدہ عرب امارات (یو اے ای) کے ساتھ اٹھانے کا اعلان کیا ہے۔ خیال رہے کہ شیخہ لطیفہ نے الزام لگایا ہے کہ ان کے والد نے انہیں دبئی میں اس وقت سے یرغمال بنایا ہوا ہے جب انہوں نے سال 2018 میں فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ برطانوی نشریاتی ادارے (بی بی سی) کی رپورٹ کے مطابق ادارے کو حال ہی میں موصول ہونے والی خفیہ طور پر ریکارڈ کی گئی ویڈیوز میں شیخہ لطیفہ نے کہا ہے کہ انہیں خطرہ ہے کہ انہیں مار دیا جائے گا۔ شہزادی لطیفہ کی خفیہ ویڈیو منظر عام پر آنے کے بعد عالمی سطح پر اقوام متحدہ سے مذکورہ معاملے کی تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جبکہ برطانیہ کی جانب سے ان ویڈیوز کو (انتہائی پریشان کن) قرار دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق نے اس حوالے سے جاری بیان میں کہا ہے کہ وہ شیخہ لطیفہ کے معاملے پر جلد متحدہ عرب امارات سے پوچھ گچھ کریں گے۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کے ترجمان نے کہا کہ ہم یقینی طور پر اس پیشرفت کو متحدہ عرب امارات کے ساتھ اٹھائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے نظام کے دیگر حصے بھی ایک مرتبہ اس نئے مواد کا جائزہ لینے کے بعد متعلقہ مینڈیٹ کے ساتھ مذکورہ معاملے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ برائے جبری حراست کے ترجمان نے کہا کہ وہ شیخہ لطیفہ کی ویڈیوز جائزہ کے بعد تحقیقات شروع کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے برطانیہ کے سیکریٹری خارجہ ڈومینیک راب نے کہا کہ ہمیں بہت زیادہ تشویش ہے۔ انہوں نے کہا کہ ویڈیوز میں ایک نوجوان خاتون کو شدید پریشانی کا شکار دکھایا گیا، انہوں نے مزید کہا کہ برطانیہ اقوام متحدہ کی جانب سے بھی ہونے والی کسی بھی پیشرفت کو بہت قریب سے دیکھے گا۔ دوسری جانب برطانیہ کے وزیر اعظم بورس جانسن نے بھی کہا ہے کہ ان کی حکومت کو اس معاملے پر تشویش ہے لیکن وہ انتظار کریں گے اور دیکھیں گے اقوام متحدہ کیسے تحقیقات کرتا ہے۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والی شیخہ لطیفہ کی یہ ویڈیوز گزشتہ کئی ماہ کے دوران ایک فون پر ریکارڈ کی گئیں جو ان کی گرفتاری اور دبئی واپسی کے لگ بھگ ایک برس بعد انہیں خفیہ طور پر دیا گیا تھا۔ شیخہ لطیفہ نے یہ ویڈیوز باتھ روم میں ریکارڈ کیں کیونکہ وہ صرف باتھ روم کا دروازہ ہی لاک کر سکتی تھی۔ ان خفیہ ویڈیوز میں انہوں نے اپنی گرفتاری اور اس کے بعد کی تفصیل بتائی، انہوں نے کہا کہ جب انہیں کشتی سے اتارا جا رہا تھا تو انہوں نے فوجیوں سے لڑائی کی اور ایک اماراتی کمانڈو کے بازو پر زور سے کاٹا کہ وہ چیخ اُٹھا۔ شیخہ لطیفہ نے بتایا کہ بیہوشی کی دوا دینے کے بعد انہیں ایک نجی طیارے میں لے جایا گیا اور دبئی میں طیارہ لینڈ ہونے تک وہ نہیں اٹھی۔ شہزادی کے مطابق انہیں طبی اور قانونی مدد تک رسائی کے بغیر ایک ولا میں تنہا رکھا گیا جس کی کھڑکیاں اور دروازے بالکل بند اور گھر کے باہر پولیس کا پہرا تھا۔ شیخہ لطیفہ کو دبئی سے فرار کے دوران پکڑے جانے اور ان کو قید کرنے سے متعلق ان کی ایک قریبی دوست ٹینا جوہینن، ایک کزن مارکس ایسابری اور ایک سرگرم کارکن ڈیوڈ ہیئے نے بتایا، یہ تینوں افراد شہزادی کی آزادی کی مہم (فری لطیفہ) چلا رہے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ یہ پیغامات جاری کرنے کا فیصلہ شیخہ لطیفہ کی حفاظت سے متعلق تشویش کے باعث کیا گیا۔ شہزادی کی قریبی دوست ٹینا جوہنین کے مطابق ان سے رابطہ منقطع ہوئے بہت زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ خیال رہے کہ شیخہ لطیفہ نے 2 مرتبہ دبئی سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور وہ دونوں مرتبہ ہی ناکام ہوئیں انہیں 2002 اور 2018 میں پکڑ کر دبئی واپس لایا گیا تھا۔ انہیں پہلی مرتبہ فرار ہونے کی کوشش سے قبل اپنے والد کی ہدایات پر 3 سال تک کے لیے قید کیا گیا تھا، مارچ 2018 میں ان کی دوسری قید عالمی شہ سرخیوں کا حصہ بنی تھی۔ شیخہ لطیفہ کی ایک دوست نے بتایا تھا کہ کمانڈوز نے انہیں اس وقت گرفتار کیا تھا جب وہ بحر ہند میں سمندری راستے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی، کمانڈوز نے انہیں کشتی سے گھسیٹ کر باہر نکالا، تشدد کیا جبکہ وہ چیختی رہیں تاہم کمانڈوز انہیں ہراساں کرتے رہے۔ علاوہ ازیں دبئی کے حکمران کی اہلیہ 45 سالہ شہزادی حیا بنت الحسین اپریل 2019 میں اپنے شوہر سے خوفزدہ ہو کر متحدہ عرب امارات سے فرار ہو گئی تھیں اور انہوں نے اپنے 2 بچوں کی واپسی کے لیے کیس دائر کیا تھا۔ گزشتہ برس اسی کیس کی سماعت کے دوران ہائی کورٹ آف انگلینڈ اینڈ ویلز کے فیملی ڈویژن کی سربراہی کرنے والے جج اینڈریو مکارلین نے شیخ محمد کو شیخہ شمسہ کے برطانوی شہر کیمبرج سے اگست 2000 میں ان کے اغوا کا حکم دینے اور اس کی منصوبہ بندی میں ملوث پایا، اس وقت شیخہ شمسہ 19 برس کی تھیں۔ جج نے کہا تھا کہ شیخہ شمسہ کو دبئی واپسی پر مجبور کیا گیا تھا اور گزشتہ 2 دہائیوں سے ان کی آزادی چھینی گئی جبکہ شیخہ لطیفہ کو 2 مرتبہ 2002 اور 2018 میں پکڑ کر دبئی واپس لایا گیا تھا۔ لندن کی عدالت نے کہا تھا کہ شیخ محمد نے ایسے حالات قائم کر رکھے ہیں جہاں دونوں نوجوان خواتین کو آزادی سے محروم رکھا گیا۔ عدالت میں مذکورہ معاملہ زیر غور آنے کے بعد شیخہ لطیفہ کے دوست پُرامید تھے کہ شاید عدالت کے فیصلے کے بعد کچھ فائدہ ہو لیکن ایسا نہیں ہوا اور اب انہوں نے شہزادی کے پیغامات جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

رپورٹ

مادری زبانوں کا عالمی دن

علی حسنین مسعود (بیورو چیف سینٹرل پنجاب لاہور انٹرنیشنل لندن)

نومبر 1999 کو اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی انسانی میراث کے تحفظ کی جنرل کانفرنس کے اعلامیہ میں 21 فروری کو مادری زبانوں کا علمی دن منانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اسکے بعد سنہ 2000 سے اس روز دنیا بھر میں تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی کی تحقیق کے مطابق دنیا میں 7000 ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے مطابق 1950 سے لیکر اب تک 230 مادری زبانیں ناپید ہو چکی ہیں۔ ہر ملک کی طرح پاکستان میں بھی یہ دن 21 فروری کو منایا جاتا۔ ایک اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی چین کی زبان مندرین ہے اسکو تقریباً ایک ارب افراد بولتے ہیں دوسرے نمبر پر ہسپانوی زبان ہے جسکو 400 ملین افراد بولتے ہیں اور تیسرے نمبر پر انگریزی زبان ہے اسکو 335 ملین افراد بولتے ہیں۔ یہ ایک اصول بن گیا ہے کہ بچے کی تعلیم اس زبان میں ہی ہونی چاہئے جو اسکے ماں باپ گھر پر بولتے ہیں۔ مثال کے طور پر گاؤں کا بچہ گھر میں ککڑی سیکھتا ہے لیکن جب وہ سکول جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ مرغی ہے۔ انگریزی میں اسے چکن کہتے لیکن اتنے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں کہ وہ کنفیوژن کا شکار ہو جاتا ہے اور پڑھ نہیں پاتا۔ پنجابی اسے آتی ہے اس لیے اسکو پنجابی میں پڑھایا جائے تو کم از کم خواندگی کا مسئلہ تو حل ہو سکتا ہے۔ جن قوموں نے اپنے بچوں کو مادری زبان میں تربیت اور فروغ دیا ہے وہ آج دنیا کی ترقی یافتہ ہیں مسال کے طور پر چین، جاپان، جرمنی اور دیگر ممالک۔

دنیا کے تمام ماہرین اس بات سے متفق ہیں کہ متعدد وجوہات کی بنا پر مادری زبان قابل قدر ہے۔ مادری زبان میں بچوں کی علمی نشوونما اچھے انداز میں ہوتی ہے جو کہ انتہائی اہم ہے۔ ہر سال 21 فروری کو دنیا بھر میں مادری زبانوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی چیئرنگ کراس مال روڈ لاہور پنجاب اسمبلی کے سامنے مادری زبانوں کے عالمی دن کے موقع پر ایک ریلی کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے طلبا سمیت مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے خواتین و حضرات نے سینکڑوں کی تعداد میں شرکت کی۔ سول سوسائٹی، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ اور پنجابی پڑھاو تحریک

کے زیر اہتمام یہ ریلی منعقد ہوئی جبکہ اس میں پروگریسو سٹوڈینٹس کولیکٹیو، حقوق خلق موومنٹ، پنجاب لوک سنگت، پنجابی سنگت، پاکستان مزدور کسان پارٹی، پنجاب ٹیچرز یونین، پنجاب پروفیسرز اینڈ لیکچرار ایسوسی ایشن کے نمائندوں سمیت دیگر نے بھی شرکت کی۔ شرکا میں ثقافتی کارکن، ادیب، شاعر، فنکار، گلوکار اعر طلبا شامل تھے۔ شرکا نے پنجابی بینرز اور پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے جو کہ پنجاب کا کلچرل ہے۔ پی پی پی کے سینیٹر اعتزاز احسن نے کہا کہ اپنے بچوں کو انکی مادری زبان میں تعلیم دیں کوئی بھی ملک اپنی ثقافت اور زبان کی پیروی کیے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ ہمارے بچوں کو پہلے ایک بات پنجابی میں سمجھنی ہوگی، بعد میں وہ اسے اردو میں اور آخر میں انگریزی میں ترجمہ کریں گے اور انہوں نے پڑھائی کو بوجھ سمجھ لیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے نوبل پرائز حاصل کرنے والے ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی نہیں اپنایا۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا صوبہ پنجاب میں پنجابی زبان کو نافذ کیا جائے۔ معروف سکالر مولانا ناصر مدنی نے اپنے خطاب میں کہا کہ زبان رابطہ کا بنیادی ذریعہ ہے جس سے لوگ آپس میں رابطہ قائم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تحقیقوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بچے اپنی مادری زبانوں میں بہت بہتر سیکھتے ہیں، انہوں نے ترقی یافتہ ممالک کی بہت سی مثالوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا جنہوں نے اپنی مادری زبانوں میں اپنے بچوں کی تعلیم میں کامیابی کے ساتھ نافذ کیا ہے وہ آج دنیا میں کامیاب ہیں۔ پنجابی زبان دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے یہاں پڑھائی نہیں جاتی۔ قومی کبڈی ٹیم کے کپتان شفیق چشتی نے کہا کہ پاکستان کے تمام صوبوں کو انکی اپنی مادری زبانوں میں تعلیم کا حق فراہم کیا گیا لیکن پنجاب میں اس حق سے حکومت نے محروم کیا ہوا ہے جو ایک بہت بڑی آبادی کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ریلی میں نمایاں شخصیات میں فوک گلوکار فضل جٹ، بابا نجمی، افضل ساحر، پروین ملک، اداکار راشد محمود، احمد رضا وٹو، امین حفیظ، احمد اقبال بزمی، میاں آصف علی، مدثر اقبال بٹ، امجد سلیم، یوسف پنجابی، دیپ سعیدہ، جمیل فریدی اور موتیا مسعود شامل تھے۔

عدل وانصاف سے روگردانی خدا کا قہر

تحریر: ابن قدسی

ناموس رسالت کا نعرہ لگا کر دوسرے کی جان لے لینا عشقِ رسالت کا معیار بن گیا ہے۔جس نے جتنی زیادہ جانیں لیں وہ اتنا ہی بڑا عاشق رسول سمجھا جاتا ہے۔اس نام نہاد محبت کے کاروبار میں حقیقی عشق رسول ﷺ کی تلاش مشکل امر بنتی چلی جارہی ہے۔زبان سے اقرار کے مطابق عمل ہونا بہت ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ O کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ O (الصّف 3-4) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم کیوں وہ کہتے ہو جو کرتے نہیں اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔

نعرہ رسول کریم ﷺ کی محبت کا لگا کر اس محبت کو نعرہ تک ہی محدود کر دیا گیا ۔صرف زبان سے اظہار ہی نظر آتا ہے کیونکہ رسول کریم ﷺ کی محبت یہی ہے کہ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (آل عمران 32) تُو کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ سے بھی محبت کرنی ہے تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے رسول کریم ﷺ کی پیروی۔رسول کریم ﷺ کی پیروی یہی ہے کہ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی تعلیم پر عمل کیا جائے۔آپ ﷺ نے امت کی اصلاح کے لیے جو جو باتیں بتائی ہیں اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا جائے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا جائے۔اگر ایسا نہیں ہے تو محبت رسول ﷺ کا نعرہ ایک زبانی نعرہ ہے جو عمل کے بغیر ہے۔زبان کچھ اور کہہ رہی ہے اور عمل کچھ اور تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے ۔باتیں کرنا بہت آسان کام ہے، اس لیے دعویٰ دار بے شمار سامنے آجاتے ہیں لیکن عمل کرنے والے کم ہوتے ہیں۔رسول کریم ﷺ نے زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے نصائح اور ہدایات بیان فرمائی ہیں ان پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔اگر کسی امر کے متعلق واضح ہدایت بیان فرمائی ہو تو اس سے انحراف کسی صورت ممکن نہیں۔معاشرہ میں عدل وانصاف کی اہمیت سب پر عیاں ہے۔جس معاشرہ میں عدل وانصاف موجود ہو اس کی ہیبت اور صورت قابل تحسین ہوتی ہے۔اس لیے رسول کریم ﷺ نے عدل وانصاف کے قیام پر بہت زور دیا۔رسول کریم ﷺ کے زمانے میں ایک مخزومی قبیلہ سے تعلق رکھنے والے عورت فاطمہ بن اسود نے چوری کی۔جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزا کے طور پر اس کے ہاتھ کاٹے جانے تھے۔اس حوالے سے اس عورت کی قوم میں کافی بے چینی ہوئی۔انہوں نے اپنی قوم کی بے عزتی سمجھی۔اس لیے انہوں نے کوشش شروع کر دی کہ کسی طریق سے سزا رکوائی جائے۔اس کے لیے انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا انتخاب کیا کہ وہ رسول کریم ﷺ کے پاس جا کر سفارش کریں۔چنانچہ وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرنے کا کہا (کہ اس کا ہاتھ چوری کے جرم میں نہ کاٹا جائے)۔عروہ نے بیان کیا کہ جب اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! تم مجھ سے اللہ کی قائم کی ہوئی ایک حد کے بارے میں سفارش کرنے آئے ہو۔اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میرے لیے دعا مغفرت کیجئے، یارسول اللہ! پھر دوپہر بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خطاب کیا، اللہ تعالیٰ کی اس کے شان کے مطابق تعریف کرنے کے بعد فرمایا: امابعد! تم میں سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہو گئے کہ اگر ان میں سے کوئی معزز شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کوئی کمزور چوری کر لیتا تو اس پر حد قائم کرتے اور اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرلے تو میں اس کا ہاتھ کاٹوں گا۔اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے لیے حکم دیا اور ان کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔پھر اس عورت نے صدق دل سے توبہ کر لی اور شادی بھی کر لی۔عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ بعد میں وہ میرے یہاں آتی تھیں۔ان کو اور کوئی ضرورت ہوتی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیتی۔(صحیح بخاری حدیث نمبر 4304، کتاب: کتاب غزوات کے بیان میں)

عدل وانصاف کے حوالے سے رسول کریم ﷺ کی اس واضح ہدایت کی موجودگی میں امت کو اس حوالے سے خصوصی تگ ودو کرنی چاہیے۔اس وقت کی ایک معزز قوم کی عورت نے جرم کیا تو اسے معزز قوم کی وجہ سے سزا سے بچانے کی کوشش کی گئی۔اس پر رسول کریم ﷺ نے تنبیہ کی رنگ میں ایک ایسی حقیقت بیان فرمائی جس کو سننے کے بعد امت کو اس حوالے سے بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے تھا۔تنبیہ یہ تھی کہ پہلے لوگوں کے ہلاک ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ انہوں نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے ترک کر دیے۔جس معاشرے میں امیر اور غریب کے لیے الگ الگ قانون ہو

وہ کبھی اپنے آپ کو ابتری اور لاقانونیت سے دور نہیں رکھ سکتا۔ انصاف اور حقوق میں برابری بہت ہی ضروری امر ہے اگر ایسا نہ ہو تو دو سگے بھائیوں میں بھی افتراق اور دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے رسول کریم ﷺ نے بطور خاص یہ بھی نصیحت فرمائی کہ

أَخْبَرَنَا يَعْقُوبُ بْنُ سُفْيَانَ قَالَ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ حَاجِبِ بْنِ الْمُفَضَّلِ بْنِ الْمُهَلَّبِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ يَخْطُبُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اعْدِلُوا بَيْنَ أَبْنَائِكُمْ اعْدِلُوا بَيْنَ أَبْنَائِكُمْ

(سنن نسائی، حدیث نمبر 3717، کتاب: کتاب: عطیہ سے متعلق احکام ومسائل باب: عطیہ کرنے کے بارے میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت کے ناقلین کے لفظی اختلاف کا بیان)

حضرت مفضل بن مہلب سے روایت ہے کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو خطبے کے دوران میں فرماتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے بیٹوں کے درمیان انصاف کرو۔ اپنے بیٹوں کے درمیان عدل کرو۔''

امت کے بانی نے اپنی امت کو اس قدر باریکی میں جا کر انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی تلقین کی۔ والدین کو اپنی ساری اولاد ہی پیاری ہوتی ہے لیکن والدین کی اولاد کے حق میں ناانصافی اور عدل کے تقاضے پورے نہ کرنے کی صورت میں ان کے درمیان نفرت اور دوریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ انصاف اور عدل کی اس قدر اہمیت ہے اور بطور خاص اس گہرائی میں بیان کرنا بتاتا ہے یہ مضمون کس قدر نازک اور ضروری ہے۔ والدین کی عدل وانصاف سے روگردانی دو سگے رشتوں کو بھی دور کر دیتی ہے تو معاشرے کے وہ افراد جن میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا وہ عدم انصاف اور عدل کی عدم دستیابی کے بعد کیسے امن وسکون سے رہ سکتے ہیں۔

عدل وانصاف تو امت محمدیہ کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ امت ہی عادل امت ہے۔ فرمایا

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ، حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ، حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَوْلِهِ: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا سورة البقرة آية 143، قَالَ: عَدْلًا ، قَالَ أَبُو عِيسَى: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ. (جامع ترمذی حدیث نمبر 2961، کتاب: کتاب: تفسیر قرآن کریم، باب: باب: سورۃ البقرہ سے بعض آیات کی تفسیر)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت: »وكذلك جعلناكم أمة وسطا« ''ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا ہے'' (البقرہ: ۱۴۳) کے سلسلے میں فرمایا: ''»وَسَط« سے مراد عدل ہے'' (یعنی انصاف پسند)۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

رسول کریم ﷺ انصاف کرنے والوں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں نور کے منبروں پر رحمٰن کی دائیں جانب ہوں گے۔ جو عدل کرتے ہیں اپنے فیصلوں میں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ اور اپنی رعایا کے ساتھ۔''

(سنن نسائی، حدیث نمبر 5381، کتاب: کتاب: (قضا اور) قاضیوں کے آداب ومسائل کا بیان، باب: فیصلے میں انصاف کرنے والے حاکم کی فضیلت)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں واضح طور پر حکماً عدل وانصاف کی تاکید فرماتا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا۔

(سورۃ النساء: 58)

مسلمانو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (المائدہ 9)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر مضبوطی سے نگرانی کرتے ہوئے انصاف کی تائید میں گواہ بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہرگز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ اس سے ہمیشہ باخبر رہتا ہے جو تم کرتے ہو۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الانعام 153)

اور سوائے ایسے طریق کے جو بہت اچھا ہو یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورے کیا کرو ہم کسی جان پر اس کی وسعت سے بڑھ کر ذمہ داری نہیں ڈالتے اور جب بھی تم کوئی بات کرو تو عدل سے کام لو خواہ کوئی قریبی ہی (کیوں نہ) ہو اور اللہ کے (ساتھ کئے گئے) عہد کو پورا کرو یہ وہ امر ہے جس کی وہ تمہیں سخت تاکید کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

إِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الحجرات 10)

اور اگر مومنوں میں سے دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرواؤ پس اگر ان میں سے ایک دوسری کے خلاف سرکشی کرے تو جو زیادتی کر رہا ہے اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف لوٹ آئے پس اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل سے صلح کرواؤ اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ (الاعراف 30) تُو کہہ دے کہ میرے ربّ نے انصاف کا حکم دیا ہے۔

مملکت خداداد پاکستان کی سڑکوں پر لبیک یا رسول اللہ ﷺ کے نعرے بہت بلند آواز سے سنائی دینگے لیکن عدل وانصاف کی فراہمی کے حوالے سے ایک عالمی تحقیقاتی ادارے کے مطابق عدلیہ کی کارکردگی کے حوالے سے 128 ممالک میں پاکستان 120 نمبر پر ہے۔

امریکہ کے ورلڈ جسٹس پروجیکٹ کے تحت گزشتہ کئی برسوں سے دنیا کے مختلف ممالک میں عدلیہ کی کارکردگی اور عدالتی نظاموں سے متعلق اعداد شمار جمع کیے جاتے ہیں۔ دنیا کے 128 ممالک کے ڈیٹا پر مشتمل اس ادارے نے اس سال اپنی جو تفصیلات جاری کی ہیں ان میں قانون کی بالادستی یا رول آف لاء ایک انتہائی اہم انڈیکس ہے۔ اس طرح کے کوئی اعداد وشمار سامنے آئیں تو بحیثیت قوم ردعمل یہی ہوتا ہے کہ یہ دشمنوں کی سازش ہے ایسے جیسے پاکستان میں عدل وانصاف کا بول بالا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتی لیکن صورتحال یہی ہے کہ قانون کے نفاذ کے ذمہ دار ادارے دن دیہاڑے 14 لوگوں کو گولیاں مار کر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیتے ہیں جس میں خواتین بھی شامل ہوتیں ہیں۔ گولیاں چلانے والوں کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے کے لیے گولیاں کھانے والوں کو دھرنا دینا پڑتا ہے۔ ایک معتبر ادارے کے سربراہ نے دخل اندازی کی پھر کہیں جا کر ایف آئی آر درج ہوئی۔ حالانکہ ایف آئی آر انصاف کی فراہمی کی طرف پہلا قدم ہے اس کے بعد عدالتی کارروائی کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو بعض اوقات نسل در نسل چلتا ہے۔ تاریخ پر تاریخ پڑتی چلی جاتی ہے اور انصاف ہوتا نظر نہیں آتا۔ اتنے لمبے مراحل میں بڑے لوگ تو بآسانی ادھر ادھر ہو جاتے ہیں لیکن غریب سالوں جیل میں پڑا رہتا ہے۔ بعض اوقات جرم کے نتیجہ میں ملنے والی سزا کم ہوتی ہے لیکن جیل میں فیصلہ کا انتظار لمبا ہو جاتا ہے۔ رحیم یار خان کے دو بھائی غلام قادر اور غلام سرور کے ساتھ تو اس سے بڑا عجیب واقعہ ہو گیا تھا۔ سپریم کورٹ نے جس جرم میں ان دونوں بھائیوں کی اپیل پر انہیں باعزت بری کیا، اس فیصلہ کے آنے سے پہلے اسی جرم میں دو سال قبل ان کو پھانسی ہو چکی تھی۔ اب دونوں کے گھر والے کس کا گریبان پکڑیں۔ نچلی عدالتیں ان کو پھانسی پر چڑھا دیتی ہیں اور سپریم کورٹ ان کو بری کر دیتی ہے۔ بری اس وقت کیا جب ان کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی تھیں۔ یہ عدالتی نظام کے گلے سڑے ہونے کی نشانی ہے۔ یہ تو ہے اس نظام کی سست روی اور اس کی فرسودگی اور بوسیدگی۔ ناانصافی کی مثالیں بھی بے شمار ہیں۔ جہاں عدلیہ کے منصفین کے فیصلہ جات پر سوالیہ نشان ہے۔ ممتاز قانون دان حامد خان اپنی کتاب 'A history of judiciary in Pakistan' میں لکھتے ہیں کہ پاکستانی عدلیہ کی تاریخ میں منصفین کس طرح استعمال ہوتے رہے۔ تاحیات نااہل "شریف" کے لیے چھٹی والے دن بھی عدالت کھل جاتی ہے۔ اربوں کھربوں کی کرپشن کے الزامات والا 50 روپے کے اسٹام پیپر پر ملک سے باہر چلا جاتا ہے لیکن ایک غریب آدمی فیصلہ کے انتظار میں جیل میں ہی اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ اسی ناانصافی کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ملکی اداروں سے منسلک افراد اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران جان گنوا دیں تو ان کے گھر والوں کو بھی انصاف نہیں ملتا۔ کوئٹہ میں ایک غریب ٹریفک سارجنٹ جو اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا اسے ایک بااثر ایم پی اے مجید اچکزئی نے نشے کی حالت میں کچل کے شہید کر دیا اور اس کی ویڈیو بھی وائرل ہوگی لیکن تف ہے ایسی ناانصاف عدل پہ مبنی امیروں کی عدالت پر جنہوں نے شواہد ناکافی ہونے کی صورت میں اسے باعزت بری کر دیا ہے بیچارے اہلخانہ کو مایوسیوں کے اندھیروں میں دھکیل دیا اور بااثر ایم پی اے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔ عدلیہ کے نظام سے وابستہ کالوگوں کا حال بھی کسی دہشت گرد سے کم نہیں۔ سفید کوٹ اور کالے کوٹ کی معمولی بات پر تلخ کلامی ہوتی ہے اور کالے کوٹ والے ایک جلوس بنا کر ہسپتال پر حملہ کر دیتے ہیں اور وہاں علاج کے لیے آئے مریضوں پر بھی تشدد کرتے ہیں لیکن کوئی پرسان حال نہیں۔ کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی ایک اور واقعہ ہوا۔ ہائی کورٹ اسلام آباد کے حکم سے غیر قانونی تجاوزات ہٹانے کے لیے حکم دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں کچھ وکلاء کے چیمبر بھی گرائے گئے جو سرکاری زمین پر بنے ہوئے تھے۔ کالے کوٹوں والوں نے پھر جلوس نکالا اور ہائی کورٹ پر حملہ کر دیا۔ چیف جسٹس جسٹس اطہر من اللہ کو یرغمال بنا لیا گیا۔ وکلاء نے ہائی کورٹ اسلام آباد میں گھس کر توڑ پھوڑ کی۔ یہ تو حال ہے اس نظام عدل سے وابستہ افراد کا۔ ان حالات میں انصاف کا کیا بول بالا ہوگا۔ ان سیاہ کاریوں کے بعد عدل وانصاف کی بات کون کرے گا۔ ججوں کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ ان کی پینٹ اتار کے مارا جاتا ہے۔ ہراساں کرنا ڈرانا دھمکانا تو معمولی بات ہے۔

پھر اگر کسی ادارے نے کوئی رپورٹ شائع کر دی تو رولا ڈالا جاتا ہے کہ ہمارے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔ کسی نے کوئی بیان دے دیا تو ملکی سالمیت کو خطرہ ہو جاتا ہے۔ حکومتی ایوانوں میں بیٹھے حکمرانوں! انصاف کے نظام کو مضبوط کرو ایسا نہ ہوں کہ یہ ناانصافیاں خدا کا قہر بن کر اس ملک پر ٹوٹ پڑیں۔

دوسروں کے عیوب چھپانا اور ناحق قتل کرنا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اگر کسی کا عیب آجاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے چھپاتے اور اگر کوئی اپنا عیب ظاہر کرتا تھا تو اس کو بھی عیب ظاہر کرنے سے منع فرماتے تھے۔۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جو بندہ کسی دوسرے بندے کا گناہ دنیا میں چھپاتا ہے۔اللہ تعالی اس کے گناہ قیامت کے دن چھپائے گا۔(مسلم)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے تھے کہ میری امت میں سے ہر شخص کا گناہ مٹ سکتا ہے (یعنی توبہ سے) مگر جو اپنے گناہوں کا اظہار کرتے پھریں ان کا کوئی علاج نہیں۔پھر فرماتے کہ آپ اظہار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص رات کے وقت گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالی اس پر پردہ ڈال دیتا ہے مگر صبح کے وقت وہ اپنے دوستوں سے ملتا ہے تو کہتا ہے اے فلانے میں نے رات کو یہ کام کیا تھا، اے فلانے میں نے رات کو یہ کام کیا تھا۔رات کو خدا اس کے گناہ پر پردہ ڈال رہا تھا صبح یہ اپنے گناہ کو آپ ننگا کرتا ہے۔(بخاری ومسلم)

بعض لوگ نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ کا اظہار توبہ پیدا کرتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ گناہ کا اظہار توبہ پیدا نہیں کرتا، گناہ کا اظہار بے حیائی پیدا کرتا ہے۔گناہ بہر حال بُرا ہے مگر جو لوگ گناہ کرتے ہیں اور ان کے دل میں شرم اور ندامت محسوس ہوتی ہے ان کے لیے توبہ کا راستہ کھلا رہتا ہے اور تقوی ان کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہوتا ہے۔کوئی نہ کوئی نیک موقع ایسا آجاتا ہے کہ تقوی غالب آجاتا ہے اور گناہ بھاگ جاتا ہے۔مگر جو لوگ اپنے گناہوں کو پھیلاتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں ان کے دل سے احساسِ گناہ بھی مٹ جاتا ہے اور جب احساسِ گناہ بھی مٹ جائے تو پھر توبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے کہا۔ یارسول اللہ میں نے زنا کیا ہے۔زنا اسلام میں تعزیری جرائم میں سے ہے یعنی اسلامی شریعت جہاں جاری ہو وہاں ایسے شخص کو جس کا زنا اسلامی اصول کے مطابق ثابت ہوجائے جسمانی سزا دی جاتی ہے۔جب اس نے کہا۔ یارسول اللہ میں نے زنا کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور دوسری طرف باتوں میں مشغول ہوگئے۔درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو یہ بتا رہے تھے کہ جس گناہ پر خدا نے پردہ ڈال دیا ہے اس کا علاج توبہ ہے اس کا علاج اعلان نہیں۔مگر اس نے اس بات کو نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ شاید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بات کو سنا نہیں اور جس طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تھا ادھر کھڑا ہوگیا اور پھر اس نے کہا یارسول اللہ میں نے زنا کیا ہے۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری طرف منہ کرلیا۔پھر بھی وہ نہیں سمجھا۔اور دوسری طرف آکر اس نے پھر اپنی بات کو دہرایا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اس کی طرف توجہ نہ کی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔پھر وہ شخص اس طرف آکھڑا ہوا جس طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تھا اور پھر اس نے چوتھی دفعہ اس بات کو دہرایا۔تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تو چاہتا تھا کہ یہ اپنے گناہ کی تشہیر نہ کرے جب تک خدا اس کی گرفت کا فیصلہ نہیں کرتا مگر اس نے چار دفعہ اپنے نفس پر خود ہی گواہی دی ہے اس لیے اب میں مجبور ہوں (ترمذی ابواب الحدود) پھر فرمایا اس شخص نے اپنے آپ پر الزام لگایا ہے۔اس عورت نے الزام نہیں لگایا۔جس عورت کے متعلق یہ زنا کا دعوی کرتا ہے اس عورت سے پوچھو۔اگر وہ انکار کرے تو اسے کچھ مت کہو۔

اور صرف اس کو اس کے اپنے اقرار کے مطابق سزا دو۔لیکن اگر وہ عورت بھی اقرار کرے تو پھر اسے بھی سزا دو۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جن امور کے متعلق قرآنی تعلیم نازل نہ ہوچکی ہوتی تھی ان میں آپ تورات کی تعلیم پر عمل کرلیتے تھے۔تورات کے حکم کے مطابق زانی کے لیے سنگساری کا حکم ہے۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس شخص کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا۔جب لوگ اس پر پتھر پھینکنے لگے تو اس نے بھاگنا چاہا، لیکن لوگوں نے دوڑ کر اس کا تعاقب کیا اور تورات کی تعلیم کے مطابق اسے قتل کردیا۔جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو سزا اس کے اقرار کے مطابق دی گئی۔جب وہ بھاگا تھا تو اس نے اپنا اقرار واپس لے لیا تھا اس لیے تمہارا کوئی حق نہ تھا کہ اس کے بعد اس کو سنگسار کرتے اس کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ شریعت کا نفاذ ظاہر ہونا چاہیے۔ایک دفعہ ایک جنگ پر کچھ صحابہؓ گئے ہوئے تھے۔راستہ میں ایک مشرک انہیں ایسا ملا جو اِدھر اُدھر جنگل میں چھپا پھرتا تھا۔اور جب کبھی اسے کوئی اکیلا مسلمان مل جاتا تو اس پر حملہ کرکے وہ اسے مار ڈالتا۔اسامہ بن زیدؓ نے اس کا تعاقب کیا۔اور ایک موقعہ

پر جا کر اسے پکڑ لیا اور اسے مارنے کے لیے تلوار اٹھائی جب اس نے دیکھا کہ اب میں قابو آ گیا ہوں، تو اس نے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں مگر اسامہؓ نے اس کے اس قول کی پرواہ نہ کی اور اسے مار ڈالا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لڑائی کی خبر دینے کے لیے ایک شخص مدینہ پہنچا تو اس نے لڑائی کے سب احوال بیان کرتے کرتے یہ واقعہ بھی بیان کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہؓ کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ کیا تم نے اس آدمی کو مار دیا تھا انہوں نے کہا ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن کیا کرو گے جب لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال کیا جائے گا کہ جب اس شخص نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا تھا تو پھر تم نے کیوں مارا؟ گو وہ قاتل تھا، مگر توبہ کر چکا تھا۔ حضرت اسامہؓ نے کئی دفعہ جواب میں کہا کہ یا رسول اللہ وہ تو ڈر کے مارے ایمان ظاہر کر رہا تھا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟ اور پھر بار بار یہی کہتے چلے گئے کہ تم قیامت کے دن کیا جواب دو گے جب اس کا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تمہارے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اسامہؓ کہتے ہیں اس وقت میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں آج ہی اسلام لایا ہوتا اور یہ حرکت مجھ سے سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ (مسلم)

گناہوں کی معافی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا احساس تھا کہ جب کچھ لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اتہام لگایا اور اتہام لگانے والوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پال رہے تھے۔ جب یہ الزام جھوٹا ثابت ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غصہ میں اس شخص کی پرورش بند کر دی جس نے آپ کی بیٹی پر الزام لگایا تھا۔ دنیا کا کون سا شخص اس کے سوا کوئی اور فیصلہ کر سکتا تھا بہت سے لوگ تو ایسے آدمی کو قتل کر دیتے ہیں مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف اتنا کیا کہ اس شخص کی آئندہ پرورش بند کر دی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سمجھایا اور فرمایا کہ اس شخص سے غلطی ہوئی اور اس نے گناہ کیا مگر آپ کی شان اس سے بالا ہے کہ ایک بندے کے گناہ کی وجہ سے اس کو اس کے رزق سے محروم کر دیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت پھر اس کی پرورش کرنے لگ گئے۔ (بخاری کتاب التفسیر)

(دیباچہ تفسیر القرآن صفحہ 262 تا 264)

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address
Private UK Pension Tracing
Personal Income Tax Return investigations
Assets Review for Inheritance Tax
Rental Income Tax Returns
Appealing - Past years HMRC Penalties
UK State Pension Entitlement Review
Preparation / Filing of prior year tax returns
Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
Duplicate - Payslips / P60s
UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

برصغیر میں اردو صحافت کا آغاز: چند جھلکیاں

تحریر: اقدس علی ہاشمی

ہندوستان میں اردو کی مطبوعہ صحافت کا آغاز اس بحرانی دور میں ہوا جب پورا ملک سماجی اور تہذیبی بدلاؤ سے گزر رہا تھا۔ انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو گیا تھا اور وہ اپنی تہذیب اور روایات کو نافذ کرنے کے درپے تھے۔ اس کشیدہ صورت حال میں اردو اخبارات نے مختلف حصوں میں اپنے بال و پر نکالنے شروع کیے۔ کہیں انہوں نے حکومت سے مقابلہ کیا تو کہیں اس کی ہمنوائی کی۔ اردو کے ان اخبارات کا موضوعاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ اخبارات سیاسی خبروں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل بھی اٹھاتے تھے۔ ان کی بڑی تعداد تحریک آزادی میں حصہ لے کر جذبہ حب الوطنی کو پروان چڑھا رہی تھی اور دار و رسن کی آزمائش سے بھی گزر رہی تھی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" نہیں بلکہ ٹیپو سلطان شہیدؒ کا "فوجی اخبار" تھا جو انہوں نے اپنی شہادت سے پانچ سال اور جام جہاں نما سے کم و بیش اٹھائیس سال قبل 1894ء یہ اخبار میں جاری کیا تھا۔ یہ اخبار خاص طور پر فوجیوں کے لے تھا۔ اس میں جہاد کے متعلق مضامین اور وطن کے دفاع سے متعلق مختلف لوگوں کی تحریر شائع ہوتی تھیں۔ سقوط سرنگا پٹنم کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی تمام فائلوں اور ساز و سامان کو نذر آتش کر دیا تھا۔ اس وقت تک پورے ملک میں کوئی بھی اردو اخبار موجود نہیں تھا۔ اس کے بعد اردو اخبار دہلی، روزنامہ اردو اخبار، پیسہ اخبار، منادی، اسلامی فریٹرنٹی، آزاد ہند اور الہلال وغیرہ کی صورت میں اردو صحافت کا یہ کارواں چلتا رہا۔ اس دور میں اخبار نکالنا ایک ذریعہ تھا سچائی کے اظہار اور اعلان کا، اس وقت حق بات کہنا اور لکھنا بہت سے صحافیوں کی موت کا باعث بنا۔ ان صحافیوں میں مولوی محمد باقر سرفہرست ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آزادی کی تاریخ اگر لکھی گئی ہے تو اس میں صحافیوں کا خون بھی شامل ہے۔ ذیل میں یکے بعد دیگرے ان گیارہ خبروں کا جائزہ لیتے ہیں جنہوں نے ایک عہد ساز جان کو جنم دیا اور بعد میں آنے والے پرچوں اور تصور صحافت کے لئے راہیں ہموار کیں۔

فوجی اخبار

ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار جاری کرنے کا سہرا سلطان ٹیپو کے سر ہے ہے۔ 1894ء میں ٹیپو سلطان نے اردو اخبار جاری کروایا جس کا نام "فوجی اخبار" تھا۔ یہ اخبار خاص طور پر فوجیوں کے لئے تھا۔ اس میں دفاع اور جہاد سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس میں فوج کی نقل و حرکت اور افسروں کے تعین اور تبادلے کی اطلاعات درج ہوتی تھیں۔ فوج کے متعلق احکامات بھی شائع کیے جاتے تھے۔ یہ اخبار سلطان کی شہادت تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ سقوط سرنگا پٹنم کے بعد انگریزوں نے اخبار کی تمام فائلوں اور ساز و سامان کو نذر آتش کر دیا تھا۔ فوجی اخبار نے آنے والے دور میں صحافت کے لئے راہ ہموار کی۔ یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔

مراۃ الاخبار

راجہ رام موہن رائے کی ادارت میں کلکتہ سے جاری ہونے والا (20 اپریل 1822ء) ہفت روزہ اخبار تھا۔ رام موہن رائے پر فلسفہ ویدانت کا گہرا اثر تھا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے "ستی" کی رسم کے خلاف مہم چلائی۔ 1828ء میں گورنر جنرل ہند لارڈ ولیم بنٹنک نے اس رسم کو قانوناً بند کر دیا۔ وہ ہندوستان خصوصاً ہندوؤں کے لیے مغربی تعلیم کے بڑے حامی تھے۔ ان کو احساس تھا کہ اپنے خیالات اپنے ہم وطنوں تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ صحافت ہی ہے۔ انہوں نے پریس آرڈیننس کے پریویو کونسل میں دائر کی گئی اپیل رد کیے جانے پر احتجاجاً اپنا اخبار 4 اپریل 1823ء کو بند کر دیا۔

جام جہاں نما

27 مارچ 1822ء کو کلکتہ سے ہری دت کے زیر ادارت جاری ہوا۔ زیادہ تر خبریں مقامی انگریزی اخباروں سے ترجمہ کر کے دی جاتی تھی۔ دیسی ریاستوں کے حالات خبر ناموں سے اخذ کیے جاتے تھے۔ یورپی قارئین اس اخبار کو اردو زبان پر مہارت حاصل کرنے کے لیے پڑھتے تھے۔ اخبار کی زبان سادہ اور انداز بیان سلجھا ہوا تھا، پہلے ایڈیٹر کا نام منشی سدا سکھ تھا۔ چھاپنے کی ذمہ داری "ولیم پیٹرس لاپ کنس اینڈ کمپنی" کے سپرد تھی۔ جام جہاں نما کشیدہ صورتحال کے باوجود دہلی کے لوگوں کی فرنگی حکام سے بیزاری کو دلیری سے شائع کرتا تھا۔ 23 جنوری 1828ء کو اخبار کو بند کر دیا گیا۔

دہلی اردو اخبار

مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 1837ء میں دہلی سے شائع کیا۔ یہ دہلی کا پہلا اردو اخبار تھا۔ اس اخبار کے ذریعے ہمیں اس عہد کی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی اور علمی سرگرمیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس اخبار کا پہلا نام "اخبار دہلی" تھا لیکن 10 مئی 1840ء کو اس کا نام "دہلی اردو اخبار" ہو گیا۔ اس اخبار میں کھل کر انگریز سرکار اور ان کے اقدامات کی مخالفت کی جاتی تھی اور اسی ضمن میں جنگ آزادی کی ناکامی اور مغلیہ سلطنت کی تاراجی کے ساتھ انگریزوں کی جانب سے مولوی محمد باقر کو شہید کر دینے کے بعد بالآخر اس اخبار کی زندگی بھی 13 ستمبر 1858ء کو ختم ہو گی۔

روزنامہ اردو اخبار

کلکتہ سے 1858ء میں مولوی قدیر الدین احمد نے جاری کیا۔ اس اخبار نے نوزائیدہ اردو صحافت کے لیے ایک مخصوص مزاج اور آہنگ پیدا کیا جس میں توانائی بھی تھی اور بوقلمونی بھی۔ اس میں روزمرہ کی علاقائی، سیاسی اور ثقافتی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جنگ آزادی کے حالات و واقعات اور اس دوران پیش آنے والے واقعات و حادثات اخبار کا حصہ تھے۔ اس زمانے میں چند دیگر اخبارات بھی چل رہے تھے لیکن

روزانہ کی بنیاد پر بہت کم پرچے نکل رہے تھے جن میں روزنامہ اردو اخبار بھی شامل ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کا نام بدل کر "اُردو گائیڈ" کر دیا گیا۔ اس میں اردو اور فارسی کالم بھی شائع ہوتے تھے۔

اخبار عام

پنڈت مکند رام یکم جنوری 1871ء کو لاہور سے جاری کیا۔ پنڈت گوپی ناتھ پہلے ایڈیٹر تھے۔ پنجاب کی اردو صحافت میں جدید دور کا آغاز اسی اخبار سے ہوا۔ پرچے میں سماجی اور معاشرتی اصلاح پر تحریریں چھپتی تھیں۔ تاریخی اور علمی مضامین کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بالعموم اور خواتین کی تعلیم کے حصول کے لیے بالخصوص زور دیا جاتا تھا۔ ملکی اور غیر ملکی اخبارات کی اہم خبروں کو جن میں سیاسی اور سماجی حالات کا تذکرہ ہوتا تھا بھی پیش کیا جاتا تھا۔ اکثر اشتہارات کے لیے چار صفحات پر مشتمل الگ ضمیمہ نکلتا تھا جن میں بیوہ خواتین کی شادی اور سماجی مسائل درج ہوتے تھے۔

پیسہ اخبار

یہ ایک اردو روزنامہ تھا جو فیروز والا سے جنوری 1887ء کو منشی محبوب عالم نے جاری کیا۔ مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" جاری کرنے پر اس کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ اس کے اداریے بہت اہم ہوتے تھے۔ سماجی اور سیاسی ہر طرح کے مسائل زیر بحث آتے۔ مسائل کا تجزیہ بالکل آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوتا، معتدل فکر کا حامل ہونے کے باوجود مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں پرجوش ہوتا تھا۔ حکومت کو خارجہ پالیسی کے بارے میں صلاح و مشورہ بھی دینے سے نہیں چوکتا تھا۔ "پیسہ اخبار سٹریٹ" لاہور اسی کی یادگار ہے۔

منادی

خواجہ حسن نظامی کے زیر ادارت دہلی سے 1909ء میں جاری ہوا۔ "منادی" روزنامہ تھا جو 1974ء تک شائع ہوتا رہا۔ ان کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی نظامی اس کے مدیر ہیں، خواجہ حسن نظامی نے ایک مرتبہ اپنے اخبار میں لکھا کہ میں ڈاکٹر اقبال کو ہندوستان کا عظیم شاعر نہیں سمجھتا۔ انہی دنوں ڈاکٹر اقبال کے گھٹنوں میں درد ہو گیا، خواجہ صاحب نے ان کو اپنا روغن فاسفورس بھیجا جس سے ان کو افاقہ ہو گیا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا کہ مجھے افاقہ ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے وہ خط اپنے اخبار میں شائع کروا دیا کہ اس تیل کے متعلق شاعر اعظم کی کیا رائے ہے۔ علامہ اقبال نے اخبار پڑھ کر کہا کہ "شکر ہے خواجہ صاحب کے روغن فاسفورس نے مجھے شاعر اعظم تو بنا دیا"۔

اسلامک فریٹرنٹی

"اسلامک فریٹرنٹی" مولانا برکت اللہ بھوپالی کے زیر ادارت 1910ء میں ٹوکیو جاپان سے جاری ہوا۔ وہ ایک بھارتی انقلابی تھے جن کی ہمدردیاں پان اسلامی تحریک کے ساتھ تھیں۔ وہ بھارت سے باہر رہ کر اپنی پرجوش تقاریر اور بیانات اپنے اخبارات کے ذریعہ عوام تک پہنچاتے تھے۔ انقلاب تحریروں کے ذریعے تحریک آزادی میں حصہ لیتے رہے۔ مستقبل پر نظر رکھنے والے ایک رہنما کی حیثیت سے انہوں نے نہ صرف انقلاب کا پرچار کیا بلکہ اس کے پس پردہ عوامل پر بھی نگاہ رکھی۔ انہوں نے سیکولر نظام حکومت کا تصور اس وقت پیش کیا جب یہ کم از کم ہندوستانی عوام کے لئے اجنبی تصور تھا۔ اس اخبار نے انقلابی تحریروں کے ذریعے تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

آزاد ہند

مدراس سے 1922ء میں محمد لطیف فاروقی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس اخبار میں مسلم مسائل کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ خاص زاویے سے کیا جاتا تھا جس میں وقتی جذباتیت، جوش و ولولہ، احتجاج اور مظلومیت کا غلبہ رہتا تھا۔ جب اردو پر توجہ دینے کی بجائے ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں کو ترجیح دی جانے لگی تو "آزاد ہند" نے مسلمانوں کے مسائل اور ان کے تدارک بالخصوص زبان کے لیے آواز اٹھائی۔ جب سانحۂ جلیانوالہ باغ پیش آیا تو ملک میں انگریزوں کے خلاف ہیجان برپا ہو تو مسلم صحافت ایک نئے بامقصد اور مثبت دور میں داخل ہو گئی چنانچہ اس صورتحال میں "آزاد ہند" نے اپنا بیانیہ بھرپور طریقے سے جاری رکھا۔

الہلال

13 جولائی 1912ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کی بنیاد رکھی۔ اخبار نے برطانوی راج پر تنقید کے ذریعے اپنا پیغام مسلم اقوام تک پہنچایا۔ اخبار نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی وجوہات کی توثیق بھی کی اور ہندوستانی مسلمانوں کو تحریک میں شامل ہونے کی تلقین بھی کی۔ اخبار نے برطانوی راج پر تنقید کے علاوہ الٰہیات، سیاسیات، جنگوں اور سائنسی پیشرفت سے متعلق متعدد امور کا احاطہ کیا۔ ستمبر 1913ء میں "الہلال" کے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی لیکن تب بھی یہ جاری رہا۔ آخر کار اخراجات کا دباؤ بڑھنے کے سبب 18 نومبر 1814ء کو اخبار بند ہو گیا۔

ادارتی نوٹ: جماعت احمدیہ قادیان کا ترجمان الفضل اخبار جون 1913ء کو جاری ہوا اور آج تک یہ احمدیہ جماعت کا مرکزی روزنامہ چلا رہا ہے۔ یہ ان کے دو خلفاء کے دور حضرت حکیم مولوی نورالدین اور حضرت مرزا بشیر الدین محمود صاحب کی زیر قیادت جاری ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول نے اس اخبار کی اجازت دی اور نام تجویز کیا۔ الفضل اخبار برصغیر کے اہم اخبارات کی طرح لوگوں میں ہر دلعزیز سمجھا جاتا تھا۔ اس میں معیاری اور اصلاحی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس اخبار نے اپنے صد سالہ دور میں کئی رنگ بدلے۔ پہلے یہ ہفت روزہ تھا پھر ہفتہ میں دو بار اور بالآخر روزنامہ جاری ہے۔ پہلے یہ ہندوستان میں اس کے بعد پاکستان اور اب یہ لندن سے جاری ہو رہا ہے۔ علاوہ ازیں جماعت احمدیہ کے کئی رسائل، اخبارات جاری کیے گئے ہندوستان اور پاکستان سے۔ پاکستان سے کئی رسائل جبری بندش اور تنگ نظری کا شکار ہو گئے۔

دنیا کی اولین فہرستِ کتب اور کتابوں کے اشاریے

مصر کے شہر اسکندریہ میں زمانۂ قدیم میں ایک عظیم کتب خانہ قائم تھا جس میں کالی ماخوس (Callimakhus) نامی ایک شخص ملازم تھا۔ کالی ماخوس کا کام کتب خانے کے مشمولات کی فہرست بنانا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں ایسا کاغذ تو تھا نہیں جیسا آج کل ہے اور کتابیں ہاتھ سے پیپی رَس (papyrus) پر لکھی جاتی تھیں۔ پیپرس دراصل ایک پودا تھا جس کے گودے سے موٹا سا کاغذ بنایا جاتا تھا۔ اس پودے اور کاغذ دونوں کا نام پیپرس ہے۔ کالیماخوس شاعر، نقاد اور دانش ور تھا اور ماہرین کا اندازہ ہے کہ اُس کا انتقال دوسو چالیس سال قبلِ مسیح کے لگ بھگ ہوا ہوگا۔ وہ نسلاً یونانی تھا۔ لیکن کالی ماخوس کی وجہِ شہرت اس کی تیار کردہ کتب خانۂ اسکندریہ کی فہرست بھی ہے جو اس نے ایک سوبیس (۱۲۰) جلدوں میں تیار کی تھی۔ کالی ماخوس کی تیار کردہ اس فہرست کو دنیا میں کتابوں کا پہلا کیٹلاگ یعنی کتابوں کی پہلی توضیحی فہرست کہا جاتا ہے اور اسی فہرست کی وجہ سے بعد کے ادوار میں قدیم یونانی ادب کی تاریخ پر تحقیقی کام میں آسانی ہوئی۔ اگرچہ کالی ماخوس کی فہرستِ کتب مکمل طور پر محفوظ نہ رہ سکی لیکن اس نے دنیا کو کتابوں کی فہرست تیار کرنے کا ایک راستہ ضرور دکھا دیا حالانکہ اس کے سامنے ایسا کوئی نمونہ بھی نہ تھا۔ اسلامی دنیا میں کچھ ایسا ہی کام ابنِ ندیم نے کیا۔ ابنِ ندیم نے عربی کی کتابوں کا ایک ایسا اشاریہ یا اِنڈیکس (index) تیار کیا تھا جس میں کتابوں کے تعارف کے ساتھ مصنفوں کے مختصر حالاتِ زندگی اور مختلف علوم وفنون کی شاخوں کا تعارف بھی شامل تھا۔ ابن ندیم کی اس کتاب کا نام ''کتاب الفہرست'' تھا جو مختصراً ''الفہرست'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ عربی زبان میں اس موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے۔

ابنِ ندیم وَرّاق تھا۔ ورّاق کا لفظ ورق سے ہے اور بظاہر یہ وَرَق بیچنے والا یعنی کاغذ فروش کے معنی میں ہے (لفظ وَرَق کا درست تلفظ رے پر زبر کے ساتھ ہے) لیکن وَرّاق جلد ساز کو بھی کہتے تھے اور کتابیں ہاتھ سے لکھ کر فروخت کرنے والے کو بھی۔ یعنی ورّاق کاتب کے مفہوم میں بھی ہے۔ کتابوں کی تصحیح اور تدوین کرنے والے کو بھی وراق کہتے تھے اور سونے اور چاندی کو کُوٹ کر ورق بنانے والا بھی وراق کہلاتا تھا۔ لیکن ابن ندیم ورّاق ان معنوں میں تھا کہ وہ کتابوں کی تصحیح اور کتابیں ہاتھ سے نقل کر کے (چونکہ چھپائی کا پریس تو تھا نہیں) بیچنے کا کام کرتا تھا جو اس زمانے میں باعزت پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ دراصل مسلمانوں کے نزدیک علم اور اس کا حصول بہت اہمیت رکھتے ہیں اور اسی لیے اس زمانے میں بغداد علم وفضل کا مرکز بن گیا تھا جہاں کئی کتب خانے تھے۔ اسلامی دنیا میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں بہت عام تھیں اور کتابوں کی بہت قدر تھی۔ محمد اسحٰق بھٹی نے لکھا ہے کہ ابنِ ندیم کا پورا نام محمد بن اسحٰق بی یعقوب الندیم تھا لیکن یہ ابنِ ندیم کے نام سے معروف ہے۔ اس کی کنیت ابوالفتح اور ابوالفرَج بھی تھی۔ یہ بغداد میں رہتا تھا اور باوجود اس کے کہ اس نے سیکڑوں کتابوں کے ناموں اور مصنفین کے کاموں نیز حالاتِ زندگی کو محفوظ کر دیا خود اس کے مستند حالاتِ زندگی بمشکل دست یاب ہوتے ہیں۔

پنجاب یونی ورسٹی کے شائع کردہ تیئیس (۲۳) جلدوں پر مبنی اردو انسائیکلو پیڈیا (اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ) کے مطابق اس کا انتقال ۳۸۵ ہجری (۹۹۶۔۹۹۵ عیسوی) میں ہوا۔ اس نے ''الفہرست'' ۳۷۷ ہجری (۹۸۸۔۹۸۷ عیسوی) میں لکھی تھی۔ ''الفہرست'' کی ایک اہمیت اور اختصاص یہ بھی ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد ابتدائی چار صدیوں میں مسلمانوں نے عربی زبان میں جن علوم پر کتابیں لکھیں اور جو ادب تخلیق کیا ان کے مآخذات کو ابن ندیم نے موضوع وار درج کیا ہے۔ مصنفین کے حالات کے ساتھ ان کی کتابوں کے نام درج کیے ہیں۔ بعض اہم قلمی کتابوں کی مختلف نقول علما کے ذاتی کتب خانوں میں موجود تھیں اور ابن ندیم ان کی کتابیاتی تفصیل بھی دیتا ہے۔ ''الفہرست'' میں جن موضوعات اور علوم وفنون پر کتابوں اور مصنفین کے ناموں کا اندراج ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں: کتابت اور رسم الخط، لغت اور نحو، شعرا اور شاعری، علمِ کلام اور متکلمین، فقہا اور محدثین، تاریخ وانساب، حساب ومہندسی وموسیقی، طب، کیمیا، مذہب۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ آٹھویں باب کے پہلے حصے میں ابن ندیم نے جہاں داستاں گوئی، مصوری اور نقاشی کا حال لکھا ہے وہاں اس باب کے دوسرے حصے میں شعبدہ بازوں، جادوگروں، جھاڑ پھونک کرنے والوں، تعویذ نویسوں اور طلسمات کے ماہرین کے بھی نام اور کام بتائے ہیں۔ جِنّات کا تذکرہ بھی اس میں ملتا ہے۔ جن قارئین کو ابن ندیم کی اس کتاب سے دل چسپی ہے ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ''الفہرست'' کا محمد اسحٰق بھٹی نے اردو میں نہایت محنت سے ترجمہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے عربی میں مطبوعہ مختلف نسخے سامنے رکھے اور مختلف ابواب کے آخر میں حواشی لکھ کر ترجمے کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا۔ بھٹی صاحب کے اس ترجمے کو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ لیکن اس کے ۲۰۱۱ء کے ایڈیشن میں شامل کتاب کے تعارف (بعنوان پیش لفظ) کو ابتدا میں شامل کرنے کی بجائے ترتیب میں پہلے باب کے ایک حصے کے بعد رکھا گیا ہے۔ تعارف یا پیش لفظ کے بعد کتاب کے پہلے باب کے بقیہ حصے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عجیب ترتیب میں کوئی حکمت یا مصلحت ہے تو فہم سے بالا ہے اور یہ قاری کے لیے الجھن کا باعث ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ابن ندیم نے عرب اور اسلامی دنیا میں کتابوں کی فہرست سازی اور اشاریہ سازی کی جس علمی روایت کی بنیاد رکھی تھی اسے عالمِ اسلام نے آگے نہیں بڑھایا اور اسلام اور اسلامی علوم وفنون سے متعلق کتابوں کی فہرستیں، مآخذات کی فہرستیں یا اشاریے بیسویں صدی کے آغاز تک بہت کم تعداد میں مرتب کیے گئے۔ ہمیں لندن یونی ورسٹی کے شعبۂ مشرقی وافریقی مطالعات کے کتاب دار اور ماہرِ کتابیات جیمز ڈگلس پیئرسن (James Douglas Pearson) کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے اسلام

اور عالمِ اسلام کے موضوع پر موجود مطبوعات کا ایک عظیم الشان اشاریہ بنایا۔ انھوں نے کتابوں کے علاوہ علمی جرائد میں مطبوعہ تقریباً پچیس ہزار ایسے مقالات و مضامین کا اشاریہ بھی بنایا جو اسلام اور اسلامی علوم کے موضوعات پر تھے اور جن کے بارے میں خطرہ تھا کہ نشان دہی نہ ہونے کے سبب محققین انھیں نظر انداز کر دیں گے اور نئے محققین کو ان پر پھر سے کام کرنا ہوگا جو بلاوجہ کی تکرار ہوگی۔ اس طرح انھوں محققین، اساتذہ اور طلبہ کا کام بہت آسان کر دیا۔ بعدازاں دیگر ماہرین کی مدد سے جیمز ڈگلس پیئرسن کی ان فہرستوں کے ساتھ دیگر کتب خانوں کے اسلامی مآخذات کی فہرستیں بھی کمپیوٹر پر ضم کر دی گئیں اور اس طرح اسلامی مطالعات کے مآخذات کا ایک عظیم اطلاعیاتی خزینہ (database) مرتب ہو گیا جسے انڈکس اسلامکس (Index Islamicus) کہا جاتا ہے۔ اس کی طباعت بھی عمل میں آئی اور یہ کمپیوٹر پر برخط یعنی آن لائن (online) بھی دست یاب ہے۔ اس طرح کے مآخذات، مطبوعات کی فہرستیں اور اشاریے یعنی اِنڈیکس محققین اور تحقیق کے طالب علموں کے لیے بہت کارآمد ہوتے ہیں اور وہ مطبوعہ کتب کی فہرستوں اور کتب خانوں کی فہرستوں کی چھانٹی سے بچ جاتے ہیں۔ افسوس کہ اردو میں اشاریوں اور فہرستِ مطبوعات کو کما حقہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ البتہ اب پہلے کی نسبت اردو میں اشاریہ سازی کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔

❁❁❁

برطانیہ کے کریم خان بین الاقوامی فوجداری عدالت کے نئے مستغیث اعلیٰ

برطانوی ماہر قانون کریم خان کو بین الاقوامی فوجداری عدالت کا نیا مستغیث اعلیٰ منتخب کر لیا گیا ہے۔ وہ فاتو بنسودا کی جگہ لیں گے، جن پر امریکا نے گزشتہ برس پابندیاں عائد کر دی تھیں۔

بین الاقوامی فوجداری عدالت کے اراکین نے جمعہ 12 فروری 2021 کو انسانی حقوق کے لیے سرگرم معروف برطانوی وکیل کریم خان کو اس عدالت کا نیا چیف پراسیکیوٹر منتخب کیا اور وہ اگلے نو برس کے لیے اپنا یہ عہدہ 16 جون کو سنبھالیں گے۔ پچاس سالہ بیرسٹر کریم خان دہشت گرد تنظیم داعش کے جرائم سے متعلق اقوام متحدہ کے خصوصی تفتیش کار کے طور اپنے کام کے لیے معروف ہیں۔ انہوں نے داعش کے شدت پسندوں کے خلاف اسی طرح چھان بین کا کام کیا، جیسے ماضی میں جرمن شہر نیورمبرگ میں نازی جنگی مجرموں کے خلاف مقدمات کے سلسلے میں اس وقت کے ماہرین نے تفتیش کی تھی۔ کریم خان برطانوی ملکہ کے وکلاء میں سے ایک ہیں اور اپنے 27 سالہ کیریئر کے دوران وہ بین الاقوامی جرائم سے متعلق کئی عدالتوں میں بطور وکیل استغاثہ یا پھر وکیل صفائی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے لیبیا کے سابق ڈکٹیٹر معمر قذافی کے بیٹے سیف الاسلام کے کیس میں بھی پیروی کی تھی۔

کریم خان کا انتخاب کیسے ہوا؟

بین الاقوامی فوجداری عدالت یا آئی سی سی کی موجودہ خاتون مستغیث اعلیٰ فاتو بنسودا کے جانشین کے طور پر انتخاب کے لیے کریم خان کے علاوہ تین دیگر قانونی ماہرین بھی امیدوار تھے۔ فاتو بنسودا چونکہ امریکا کے خلاف اس کے مبینہ جنگی جرائم سے متعلق الزامات کی تفتیش کر رہی تھیں، اس لیے ٹرمپ انتظامیہ نے ان پر کئی طرح کی پابندیاں لگا دی تھیں۔ عالمی فوجداری عدالت کے ارکان آخری وقت تک کسی امیدوار کے نام پر متفق نہیں ہو سکے تھے، اس لیے آخر کار نیویارک میں اس عمل کے لیے ووٹنگ کرانا پڑی۔ پہلے مرحلے میں کریم خان مطلوبہ حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، تاہم دوسرے مرحلے میں انہوں نے 72 ووٹوں سے کامیابی حاصل کر لی۔ ان کی کامیابی پر برطانوی وزیر اعظم ڈومینیک راب نے انہیں مبارک باد پیش کرتے ہوئے اپنی ایک ٹویٹ میں لکھا، ''بین الاقوامی قانون میں کریم خان کا وسیع تر تجربہ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ ہم گھناؤنے ترین جرائم کے ذمہ دار افراد کو جواب دہ بنانے کے ساتھ ساتھ متاثرین کے لیے انصاف بھی حاصل کر سکیں گے۔''

دنیا کے 123 ممالک دی ہیگ میں واقع اس فوجداری عدالت کے رکن ہیں۔ عدالت کے قیام سے ہی امریکا، روس اور چین اس میں شمولیت سے انکار کرتے رہے ہیں۔ اس عدالت پر اس وجہ سے بھی تنقید کی جاتی رہی ہے کہ یہ ادارہ افریقہ کے غریب ممالک پر ہی زیادہ تر توجہ مرکوز کرتا آیا ہے۔ کریم خان کے لیے اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے بعد ان کی سب سے اہم ذمہ داریوں میں افغانستان میں ہونے والے جنگی جرائم اور 2014 میں غزہ پٹی کے علاقے میں اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان لڑائی کے دوران جنگی جرائم کی تفتیش کرنا بھی شامل ہوگا۔ اسرائیل اس بین الاقوامی عدالت کا رکن ملک نہیں ہے اور وہ اس کی مخالفت کرتا ہے جبکہ فلسطینی خود مختار انتظامیہ نے 2015ء میں اس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اسی بنیاد پر آئی سی سی کا کہنا ہے کہ اسے فلسطینی مقبوضہ علاقوں میں کی جانے والی کارروائیوں اور مبینہ جنگی جرائم کی تفتیش کا اختیار حاصل ہے۔

(اے ایف پی، اے پی، روئٹرز)

❁❁❁

فائبر صحت بخش غذا ہے

اگر ہم آپ کو ایسی معجزاتی خوراک کے بارے میں بتائیں جسے کھانے کے بعد آپ کی عمر دراز ہو جائے گی تو کیا آپ اس میں دلچسپی ظاہر کریں گے؟

یہ قدرتی طور پر دل کے دورے، فالج اور ذیابیطس جیسی بیماریوں کے خطرے کو بھی کم کر دیتی ہے اور یہ آپ کے وزن، بلڈ پریشر اور کولیسٹرول لیول کو بھی قابو میں رکھتی ہے۔ یہ بھی بتا دیں کہ یہ سستی اور بازار میں عام میں دستیاب ہے۔ آخر یہ کیا ہے؟ یہ فائبر ہے، ایک تحقیق میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ہمیں کتنا فائبر کھانا چاہیے اور یہ ہماری صحت کے لیے کیسے مفید ہے۔ محققین میں سے ایک پروفیسر جان کمنگ نے بی بی سی کو بتایا کہ 'بہت ٹھوس ثبوت ہیں۔ اس سے سب تبدیل ہو جائے گا۔ لوگوں کو اس حوالے سے کچھ کرنا پڑے گا۔ فائبر یا سیلولوز پر مشتمل خوراک قبض کا جانا مانا علاج ہے اس کے صحت کے فوائد اور بھی زیادہ ہیں۔ ہمیں کتنا فائبر چاہئے؟ نیوزی لینڈ کی اوٹاگو یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف ڈنڈی کے محققین یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کی خوراک میں کم از کم روزانہ 25 گرام فائبر شامل ہونا چاہئے۔ ان کے نزدیک صحت بہتر کرنے کے لیے یہ مقدار 'مناسب' ہے جبکہ 30 گرام سے تجاوز کرنے کے اپنے فوائد ہیں۔ بس اتنا ہی فائدہ ہے؟ ایک کیلے کا کل وزن 120 گرام ہوتا ہے مگر یہ خالص فائبر نہیں ہوتا۔ اس میں سے قدرتی چینی اور پانی سمیت سب نکال دیا جائے تو تین گرام فائبر رہ جاتا ہے۔ دنیا کے بیشتر لوگ روزانہ 20 گرام سے کم فائبر کھاتے ہیں۔ اوسطاً ہر روز خواتین 17 گرام جبکہ مرد 21 گرام فائبر کھاتے ہیں۔ کن چیزوں میں فائبر زیادہ ہوتا ہے؟ آپ کو یہ پھلوں، سبزیوں، ناشتے میں استعمال ہونے والے سیریلز، بریڈ، چھلکے دار اناج سے بنے پاستا، دالوں، چنوں، میوہ جات اور بیجوں میں ملے گا۔ 30 گرام فائبر کتنا ہوتا ہے؟ ایلین رش، آک لینڈ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی کی پروفیسر ہیں۔ انھوں نے 25-30 گرام فائبر کی حد تک پہنچنے کا طریقہ بتایا ہے۔ آدھا کپ جو- 9 گرام فائبر۔ دو ویٹا بکس- 3 گرام فائبر۔ براؤن بریڈ کا بڑا اسلائس- 2 گرام فائبر۔ ایک کپ پکی ہوئی دال (4 گرام فائبر۔ چھلکے کے ساتھ پکا ہوا آلو) 2 گرام فائبر۔ آدھا کپ سفید چقندر- 1 گرام فائبر۔ ایک گاجر- 3 گرام فائبر۔ چھلکے کے ساتھ سیب- 4 گرام فائبر۔

تاہم وہ کہتی ہیں: 'فائبر کو بڑھانا آسان نہیں'۔ پروفیسر کمنگ بھی اس بات سے متفق ہیں۔ وہ کہتے ہیں: 'یہ کافی بڑی تبدیلی ہے۔ یہ کافی بڑا چیلنج ہوگا'۔ یہ کچھ چند آسان تراکیب ہیں۔ چھلکے کے ساتھ آلو پکانا۔ سفید بریڈ، پاستا اور چاولوں کو ان کی چھلکے کے ساتھ والی قسم کے ساتھ تبدیل کر لیں۔ چنے اور دالوں کا سالن بنا کر یا سلاد میں ڈال کر کھائیں۔ بے وقت بھوک کے لیے میوہ جات اور تازہ پھل۔ دن میں پانچ پھل اور سبزیاں کھائیں۔

اس کا فائدہ کیا ہوگا؟

متعدد تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد اس کے نتائج طبی جریدے لینسٹ میں شائع کیے گئے۔ ان کے مطابق اگر ایک ہزار افراد جو کہ پہلے کم فائبر والی خوراک (15 گرام سے کم) کھاتے تھے ان کو زیادہ فائبر والی خوراک (25 سے 29 گرام) پر منتقل کرنے سے 13 امراض اور دل کے امراض کے چھ معاملات سے بچا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ فائبر والی غذا کے استعمال سے ٹائپ ٹو ذیابیطس اور پیٹ کے کینسر کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں جبکہ وزن کم کرنے، بلڈ پریشر پر قابو پانے اور کولیسٹرول کی سطح بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ تحقیق کے مطابق جتنا زیادہ فائبر کھایا جائے اتنا مفید ہوتا ہے۔

فائبر جسم پہ کیا اثر چھوڑتا ہے؟

پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فائبر کچھ زیادہ نہیں کرتا۔ انسانی جسم اسے ہضم نہیں کر سکتا اور یہ بس آنتوں سے گزر جاتا ہے۔ لیکن فائبر سے ہمیں پیٹ بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے یعنی بھوک نہیں لگتی اور یہ چھوٹی آنت میں چربی جذب ہونے کے طریقے کو بھی متاثر کرتا ہے اور جب بڑی آنت میں جا کر جراثیم کی باری آتی ہے تو یہ عمل اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ بڑی آنت میں اربوں کے حساب سے بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں اور فائبر ان کی غذا ہے۔ جراثیم فائبر کو استعمال کرتے ہوئے مختلف کیمیکل بناتے ہیں۔ اس میں چھوٹے مالیکیول والے فیٹی ایسڈ ہوتے ہیں اور یہ عمل پورے جسم پر اثر کرتا ہے۔ پروفیسر کمنگ کہتے ہیں: 'یہ جسمانی عضو فائبر ہضم کرنے کے لیے ہے جو بیشتر افراد استعمال ہی نہیں کرتے'۔

'لوگ فائبر کو چھوڑ رہے ہیں'

یہ حقیقت حیران کن نہیں کہ فائبر اور چھلکے والے اناج، پھل اور سبزیاں صحت کے لیے اچھے ہیں۔ لیکن یہ بات تشویش ناک ہے کہ کم نشاستہ والی خوراک کی مقبولیت کی وجہ سے لوگ فائبر کو چھوڑ رہے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی کی پروفیسر نیتا فوروہی کہتی ہیں: 'ہمیں اس تحقیق کو سنجیدگی سے دیکھنا چاہئے'۔ اس تحقیق کے نتائج سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگرچہ غذائی طریقے جن کی بنیاد کم نشاستے والی خوراک ہیں معاشرے میں مقبول ہو رہی ہے، 'یہ تحقیق اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ فائبر اور چھلکے والا اناج لمبی زندگی کے لیے یقیناً ضروری ہے'۔ یہ تحقیق ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی مدد کے لیے بنائی گئی ہے جس کی معاونت کے ساتھ وہ اگلے سال تک فائبر کھانے اور اس کی مدد سے بہتر صحت پانے کے متعلق ضروری ہدایات جاری کرے گی۔ (بشکریہ بی بی سی)

سٹیویا پلانٹ

چینی کا بہترین متبادل جسے گھروں میں بھی لگایا جاسکتا ہے

سٹیویا اپنے میٹھے پتوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ قدرتی طور پر پیراگوئے اور برازیل میں پایا جاتا ہے لیکن اب اس کی کاشت دنیا بھر میں شروع ہوگئی ہے۔ اس کے پتے چینی سے 15 گنا زیادہ میٹھے ہوتے ہیں اور اس کے عرق میں چینی سے 200 سے 300 گنا زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ اس میں نشاستہ اور حرارے نہ ہونے کے برابر ہیں جس کی وجہ سے یہ شوگر کے مریضوں کے لیے مفید ہے اور یہ Calories حرارے خون میں شوگر کی مقدار اور بلڈ پریشر کو بھی کم کرتا ہے۔ سٹیویا نامی شوگر پلانٹ سے چائے، مشروبات کو میٹھا کر کے چینی کی سالانہ طلب میں 6 سے 8 لاکھ ٹن کمی لائی جاسکتی ہے۔ اس سے تیار کردہ مشروبات اور کھانے شوگر کے مریض بھی بلا جھجک استعمال کر سکتے ہیں۔ سٹیویا چینی کا بہترین متبادل ہے۔ اس کے پتوں سے حاصل کیے جانے والے ایک کلوگرام سفوف کی مٹھاس 300 کلوگرام چینی کے برابر ہوگی۔

ریسرچ کے بعد یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ اگر سٹیویا نامی شوگر پلانٹ کے پتوں کو چائے کی پتی کے ساتھ ملا کر پکایا یا دیگر مشروبات میں ملا کر پکایا جائے تو اس سے چینی جیسی مٹھاس پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ جراثیم کش ہے جس کی وجہ سے ٹوتھ پیسٹ میں بھی استعمال ہو رہا ہے، دانتوں کو بیماریوں سے بچانے کے ساتھ ساتھ مسوڑوں کو بھی مضبوط بناتا ہے، جلدی امراض اور کیل مہاسوں میں اس کی افادیت بھی تسلیم کی گئی ہے۔ اس میں کیلشیئم کی کافی مقدار پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کی ہڈیوں کی نشوونما کی لئے بھی مفید ہے۔ ہاضمے کے نظام اور معدے کی تیزابیت میں بھی کارآمد ہے، معدے کے السر کو بھی کم کرتا ہے۔ خون کی خلیوں کو بننے اور خون کی نالیوں کو مضبوط بنانے میں مدد کرتا ہے، انسانی جسم میں روٹا وائرس کے خلاف اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ماہرین کے مطابق ابتدائی طور پر یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ اس پودے کو فورٹ منرو اور مری سمیت نسبتاً کم درجہ حرارت رکھنے والے علاقوں میں کاشت کر کے بہترین نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ پھول آنے سے قبل اس کے پتوں کو توڑ کر سایہ میں سکھا لیا جاتا ہے اور پیس کر پاؤڈر کی شکل میں چائے یا کھانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ باقاعدہ ایک فصل ہے مگر اسے تھوڑی سی محنت سے گھروں میں گملوں میں بھی اگایا جاسکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق ابتدائی طور پر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ اس پودے کو پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں میں کاشت کر کے بہترین نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ پھول آنے سے قبل اس کے پتوں کو توڑ کر سایہ میں سکھا لیا جاتا ہے اور پیس کر پاؤڈر کی شکل میں چائے یا کھانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ باقاعدہ ایک فصل ہے مگر اسے تھوڑی سی محنت سے گھروں میں گملوں میں بھی اُگایا جاسکتا ہے۔ نرسریوں میں یہ پودا ایک سو سے تین سو روپے تک فروخت ہو رہا ہے جبکہ گورنمنٹ ایوب زرعی تحقیقاتی ادارہ جھنگ روڈ فیصل آباد سے اس کے پودے کثیر تعداد میں 10 روپے فی پودا کے حساب سے مل سکتے ہیں اور اس کا بیج بھی مل سکتا ہے لیکن زیادہ تر اس کی نرسری ٹھنڈے علاقوں میں تیار کر کے پورے ملک میں سپلائی کی جاتی ہے، تیار ہونے پر پھول نکلنے سے قبل اس کے پتے توڑ کر خشک کر کے پاؤڈر بنا لیا جاتا ہے بہتر نگہداشت سے یہ فصل پچاس سے ستر من فی ایکڑ پیداوار دے سکتی ہے۔ اس غیر روایتی فصل کی طرف توجہ کر کے کسان اچھا منافع کمانے کے ساتھ ساتھ نیچرل طریقے سے صحت مند مٹھاس کی گھریلو ضرورت پوری کر کے کیمیکلز سے تیار کردہ چینی سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ پلاسٹک کے کوپ میں اچھی قسم کی مٹی جیسے پھل میں دو تین بیج رکھ کر پانی چھڑکتے رہیں اور شاپر سے ڈھانپے رکھیں، اس کے پودے کی قلم بھی اُگ آتی ہے۔ اس کی تیاری کے دوران درجہ حرارت 15 سے 20 سینٹی گریڈ بہترین ہے۔

(تحریر و تحقیق گورنمنٹ ایوب زرعی تحقیقاتی ادارہ فیصل آباد)

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔